

رجسٹرڈ نمبر ۱۷۶۶



قیمت ۸/

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔
مینجر ”نگار“

نگار پبلشرز

تصانیف نیاز فختوری

نگار پبلشرز

نگارستان	جماستان	مکتوبات نیاز	شہاب کی سرگزشت
حضرت شب از کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مصنفین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت دو روپیہ (نگار) علاوہ محصول	ادیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۲ افسانے سترہ کے درجہ میں زبان قدرت بیان علی تحیل در پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت پانچ روپیہ (لغیر) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم	ادیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان نگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیلے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (نگار) علاوہ محصول	حضرت نیاز کا وہ عظیم الشان افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سہرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی ہمدی مضمون اور اس کی انشائیہ سحر طلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (نگار) علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بیسٹ تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول پندرہ

اردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بیسٹ نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات ہفتائیں ادیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔
جسم ۲۵ صفحات۔ قیمت نگار علاوہ محصول

نگار

ششماہی چندہ میں ”نگار“ کا جنوری نمبر
بہ وہ اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ روپیہ
کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اس کے بعد قیثا یعنی ۸ کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔
منیجر ”نگار“

جلد ۳	فہرست مضامین جون ۱۹۴۰ء	شمار
ملاحظات		۲
عربوں کی سیاسی بیداری	محمد عتیق صدیقی	۹
اُردو مختصر افسانہ میں جدید میلانات	مجنوں گورکھپوری	۲۲
میکسم گورکی اور سوویت ادب	ل۔ احمد	۲۸
چار درویش	رشید احمد صدیقی	۳۶
بعض سیاسی تصریحات		۴۶
ایک رات اور	شکر سروپ بھٹناگر	۵۲
آسمان، زمین اور سورج کی کہانی	فلک پیم	۶۳
باب الاستفسار		۶۸
مکتوبات نیاز		۷۳
منظومات	ماہر، شمیم، فراق، نظر، وجد، اثر، ظفر	۷۵

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۳۷	جون ۱۹۷۷ء	شمار ۶
--------	-----------	--------

ملاحظات

رفتار جنگ

ناروے کے حملہ کے بعد، جرمنی کا دفعتاً ہالینڈ و بلجیم پر حملہ کر دینا، فن جنگ و نیز اقتصادی نقطہ نظر سے بالکل کھلا ہوا منطقی نتیجہ تھا، لڑائی چھیڑ دینا تو مشکل نہیں لیکن ”من کردہ ام آغاز بہ پایاں کہ رساند؟“ بڑا مشکل سوال ہے۔ پھر چونکہ جنگ کی ابتدا جرمنی کی طرف سے ہوئی ہے، اس لئے اسی کو انتہائی پہونچانا ہے اور قدرتا تمام الجھنیں اسی کی طرف سے پیدا ہونی چاہئے۔

ہالینڈ فتح کر لینے کے بعد جرمنی نے کوشش کی کہ صلح ہو جائے، لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے سمجھ لیا کہ اپنی زندگی یا کامیابی کے لئے اسے لڑنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں اور آخر کار پورے چھ مہینے کی فکر و طیاری کے بعد اس نے ڈنمارک اور ناروے پر حملہ کیا۔

چونکہ نازی حکومت ایک قطعی فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے اپنی پوری قوت اس جنگ میں صرف کر دینا ہے، اس لئے اسے سویڈن کے لوہے کی طرف سے مطمئن ہو جانا ضروری سمجھا جس کی صورت صرف یہ تھی کہ وہ ناروے کے سواصل اور خصوصیت کے ساتھ ساحل ناروے پر قبضہ کر لے، جہاں سے جاڑوں میں بھی لوہے وغیرہ کی برآمد ممکن ہے۔

ڈنمارک پر قبضہ کرنا گواس لحاظ سے بھی کافی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ دودھ اور کھن کی پیداوار کی خاص جگہ ہے لیکن زیادہ تر اس پر تسلط کا سبب یہ تھا کہ ڈنمارک کے ساحلوں سے ناروے کے مشرقی سمندر میں جہازوں کی آمد و رفت کو زیادہ آسان بناسکے

اتحادیہ کو جرمنی کی اس طیارہ کی خبر ضرور تھی، اور جیسا کہ نازی حکومت کا بیان ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی اس کوشش میں رہے ہوں کہ سواحل ناروے پر تسلط قائم کر کے جرمنی کو سوڈن اور ناروے کی پیداوار آہن و چوب سے محروم کر دیں، لیکن جرمنی نے اتحادیہ کی اس طیارہ سے پہلے ہی دھاوا کر دیا اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اتحادیہ اس وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ ناروے پر بدستور اس کا اقتدار قائم ہے اور سوڈن کی پیداوار بالکل اس کے ہاتھ میں ہے۔ خیال تھا کہ ناروے کے بعد وہ سوڈن پر بھی حملہ کرے گا اور یقیناً یہی ہوتا لیکن سوڈن نے دانشمندی سے کام لیکر جرمنی کو مطمئن کر دیا کہ اس کا کوئی طرز عمل معاندانہ نہ ہوگا اور اس طرح شمال میں لڑائی کی آگ صرف ناروے تک پہنچ کر رہ گئی

اگر اتحادیہ اس کے بعد خاموش رہ جاتے اور بحر شمال یا ڈنمارک کے آس پاس سرنگیں بچھا کر جرمنی کے لئے ناروے کے راستہ کو خطرناک نہ بنا دیتے، تو شاید لڑائی کا نقشہ یہ نہ ہوتا، لیکن چونکہ اتحادیہ نے ناروے کے ساحلوں پر بھی قبضہ کرنا چاہا اور بحر شمال کو بھی جرمنی کے لئے خطرناک بنا دیا، اس لئے وہ مجبور ہو گیا کہ اتحادیہ کی قوت کو دو محاذ میں تقسیم کر دے اور اس نے ہالینڈ و بلجیم پر حملہ کر کے دنیا کی توجہ شمال کی طرف سے ہٹا کر پھر مغرب کی طرف مائل کر دی۔ اتحادیہ کو سمجھنا چاہئے تھا کہ ان صورتوں میں ناروے کے بعد ہالینڈ و بلجیم پر جرمنی کا حملہ کیا یقینی ہے اور غالباً وہ جرمنی کے اس ارادہ سے بے خبر بھی نہیں تھے، لیکن افسوس ہے کہ چیمبرلین کی وزارت نے اپنی اس آگہی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور نازی حکومت نے ہالینڈ و بلجیم میں بھی اسی پیشدستی سے کام لیا جس سے ناروے میں اس نے فائدہ اٹھایا تھا اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے

چیمبرلین کی صلح پسند وزارت گزشتہ چار سال سے برابر جرمنی کے حوصلے بڑھا رہی تھی، اور جب مجبور ہو کر اس کے خلاف اعلان جنگ کیا بھی تو خدا پر بھروسہ کر کے زیادہ تر ارادہ غیبی پر اعتماد کیا گیا اور فرانس کو بھی اسی بلندی اخلاق کا درس دیا گیا۔ چنانچہ ادھر چیمبرلین اور ادھر گیلین دونوں صرف یہ دیکھتے رہے کہ جرمنی آئندہ کیا کرتا ہے اور اپنی حدود سے ایک انچ آگے بڑھ کر اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی، لیکن جب یہ فتنہ حد سے گزر چکا اور غیب سے کوئی مدد نہ پہنچی تو مجبوراً چیمبرلین کو استعفا دینا پڑا، چنانچہ ادھر برطانیہ میں مسٹر چرچل نے عنان وزارت ہاتھ میں لی، ادھر فرانس میں جنرل ویگان نے فوج کی کمان سنبھالی، لیکن اتنا وقت ضائع کرنے کے بعد کہ گزشتہ نقصان کی تلافی دشوار ہو گئی۔ مسٹر چرچل نے عنان وزارت ہاتھ میں لینے کے بعد اور کوئی قابل ذکر کام کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن دو باتوں کا

اعتراف کرنا پڑے گا، ایک یہ کہ انھوں نے وقت کی نزاکت کو چھپایا نہیں، اور چیمبرلین کی طرح خطرہ کو ضعیف و کمزور دکھانے کی کوشش کی، انھوں نے صاف صاف بیان کر دیا کہ حالات تشویش انگیز ہیں اور اس خطرہ کا مقابلہ انتظار کر کے بیٹھ رہنے سے نہیں ہو سکتا، دوسری بات یہ کہ فرانس کی فوجی قیادت کی تبدیلی اور جنرل دیگان کا اپنی فوجوں کو آگے بڑھانا بھی چرچل کی اسی جدید پالیسی کا نتیجہ ہے۔ بہر حال اب جنگ نے ایک واقعیت کی صورت اختیار کر لی ہے اور اعصابی کشمکش کا دور ختم ہو گیا ہے

اس وقت بلجیم اور فرانس میں لڑائی کا جو رنگ ہے، اُس سے سب لوگ واقف ہیں، بالینڈ ختم ہو چکا اور بلجیم کا بھی بڑا حصہ جرمنی کے قبضہ میں آچکا ہے۔ اس وقت اس کی فوجوں کا زور سواحل بلجیم و فرانس کی طرف ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ رودبار انگلستان پر تسلط قائم کر کے انگلینڈ کے سواحل پر حملہ کرنا چاہتا ہے تاکہ برطانیہ کی ناکہ بندی کا جواب خود اس کے سواحل کی ناکہ بندی کر کے دے۔ جس حد تک حملہ و اقدام کا تعلق ہے، اس میں شک نہیں، نازی افواج کا پہلا بھاری نظر آتا ہے، اور اگر آج انھیں جغرافی حدود پر صلح ہو جائے جو نازی حکومت نے قائم کئے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جرمنی اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت ہے، لیکن مجھے اس کے تسلیم کر لینے میں تامل ہے کہ واقعات و حالات کا رخ یہی رہے گا

یہ جنگ اپنی نوعیت کے لحاظ سے جس قدر عجیب و غریب ہے اتنی ہی انجام کے لحاظ سے بھی ہوگی، کیونکہ اس میں جغرافی حدود کے لحاظ سے فتح و شکست کی تعین کا سوال پیدا ہونا ممکن نہیں، اس جنگ کا پس منظر یکسرتاریخی روایات ہیں، اور انھیں کو سامنے رکھ کر یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ بجائے ملکوں کے قوموں کی بقا و فنا کا سوال سامنے ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اگر یورپ میں ٹیوٹانک قوم زندہ رہی تو غیر ٹیوٹانک قوم کا فنا ہو جانا ضروری ہے، اس لئے یہ جنگ قوموں کی موت و زندگی کا فیصلہ ہے، جس پر ہم نازی افواج کے موجودہ اقدامات کو دیکھ کر کوئی حکم نہیں لگا سکتے، بلکہ اس کے لئے ہم کو برطانیہ سے زیادہ فرانسیسی نقطہ نظر کو دیکھنا چاہئے، اور اسی کے ساتھ ان امکانات کو جو اس جنگ کے زیادہ سے زیادہ وسیع ہو جانے کی صورت میں موافق یا مخالف پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فرانس کی آبادی میں سیاسی عقاید کے لحاظ سے بہت اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن جو وقت جرمنی کا سوال اُن کے سامنے آتا ہے، تو یہ تمام اختلافات دور ہو جاتے ہیں، جرمنی کی طرف سے فرانس کو تاریخی، نفسیاتی، سیاسی نین طرح کے تجربات حاصل ہوئے ہیں اور یہ سب حد درجہ تلخ ہیں۔ تاریخی حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فرانس کی ساری عمر اسی دھڑکے میں بسر ہوئی ہے کہ معلوم نہیں جرمن قوم کس وقت اس پر حملہ کرے اس کے امن و سکون کو تباہ کر دے، چنانچہ اس سے قبل تین بار ان حملوں کا تجربہ فرانس کو ہو چکا ہے، جن میں سے دو حملے تو جرمنی نے فرانس کے حدود ہی میں داخل ہو کر کئے تھے

نفسیاتی حیثیت سے اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ جرمن قوم فطرتاً جنگجو اور انتہا پسند واقع ہوئی ہے اور جب کبھی کسی لیڈر نے اس قوم کی ان فطری خصوصیات کو ابھارنا چاہا وہ فوراً اس میں کامیاب ہو گیا، خواہ وہ فریڈرک اعظم ہو یا بسمارک، قیصر ولیم پہلا، ٹلر۔ آنکھ بند کر کے اندھا دھند اپنے لیڈر کی تقلید کرنا اس قوم کی وہ خصوصیت ہے جس نے اسے اس وقت تک چین سے بیٹھنے دیا نہ فرانس کو

سیاسی حیثیت یہ ہے کہ جرمنی عرصہ تک چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے غیر منظم وفاق کی صورت میں پایا جاتا تھا اور باہمی رشک و رقابت کی وجہ سے یہ ریاستیں آپس ہی میں الجھی رہتی تھیں اور یورپ کا امن و سکون خطرہ میں نہ تھا۔ ان ریاستوں میں پریشیا اپنی فوجی روح کی وجہ سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی، اس لئے وہ رفتہ رفتہ قومی ہوتی گئی، یہاں تک کہ اُس نے ۱۸۶۲ء میں ڈنمارک کو ۱۸۶۶ء میں آسٹریا کو اور ۱۸۷۱ء میں فرانس کو شکست دیکر ایک ایسی زبردست مرکزی حیثیت اختیار کر لی کہ سیاسی حیثیت سے تمام جرمن ریاستیں اس سے متحد ہو گئیں اور اس طرح جرمن قوم کی ایک زبردست حکومت قائم ہو گئی، جو گزشتہ تین چوتھائی صدی سے یورپ کے امن و سکون کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہے

اس میں شک نہیں کہ جرمنی کے اس خطرہ سے برطانیہ کو بھی کم تعلق نہیں، لیکن فرانس کو اس خونخوار پڑوسی سے ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے اور اسی لئے فرانس نے ہمیشہ یہی چاہا کہ جرمن قوم کو اس حد تک کمزور کر دیا جائے کہ وہ پھر سر اٹھانے کے قابل نہ رہے، چنانچہ اس جنگ میں بھی اس کا برطانیہ کے دوش بدوش جرمنی سے جنگ کرنا اسی مقصد سے ہے، لیکن سامنے ہی ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہے کہ اس مدعا کی تکمیل کے لئے محض جرمنی کی فوجی تنظیم کو فنا کر دینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کی عسکری روح کو مٹانا ضروری ہے، لیکن یہ اندیشہ کہ اگر نازی حکومت یا جرمن قوم کی ذہنیت میں کوئی انقلاب ہوا تو مبادا اُس کا میلان بالشویت کی طرف ہو جائے، اتنا سخت دھڑکا ہے کہ یورپ کی جمہوری اور آمرانہ حکومتوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ جرمنی کے مسئلہ کا حل کیا ہو سکتا ہے

موجودہ جنگ میں بھی جرمنی کا سب سے زیادہ قوی الارادہ دشمن فرانس ہی ہے، چنانچہ جس وقت فتح پولینڈ کے بعد جرمنی نے صلح کی گفت و شنود کا ارادہ ظاہر کیا اور انگلستان نے بھی اس پر غور کرنا مناسب سمجھا تو فرانس کو سخت حیرت ہوئی کہ لڑائی جیتنے سے پہلے ہی صلح و امن کی جستجو کرنا کیا معنی رکھتا ہے اور اب کہ لڑائی اپنے شباب پر ہے فرانس ہی کے ۵۰ لاکھ جوان جرمنی کے مقابلہ کے لئے طیار ہیں، اس وقت وہاں کا کوئی خاندان ایسا نہیں جو اپنا پیٹ کاٹ کر لڑائی جاری رکھنے میں مدد نہ کر رہا ہو، سارا ملک ایک قومی اسلحہ سازی میں تبدیل ہو گیا ہے، جہاں شب و روز کام ہو رہا ہے اور کوئی اقتصادی ذریعہ ایسا نہیں ہے جو جرمنی کے خلاف استعمال نہ کیا جا رہا ہو، کیونکہ یہ جنگ فی الحقیقت فرانس ہی کی موت و زندگی کا سوال ہے

فرانسیسی آبادی اپنی فطرت کے لحاظ سے بہت امن پسند قوم ہے، خواہ مخواہ کسی سے لڑنا نہیں چاہتی، لیکن وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ کوئی دوسری قوم اُس کی آزادی میں مداخلت کرے، اس لئے فرانسیسی قوم کے اس جوش کے سامنے فتح پولینڈ کی روایت کو دوبارہ زندہ کرنا آسان نہیں، اس میں شک نہیں لڑائی کا آغاز جرمنی کے لئے بہت موافق ہے لیکن اس سے انجام پر حکم لگانا دشوار ہے، کیونکہ فرانس کی آبادی کا جب تک آخری قطرہ خون باقی ہے، جرمنی فرانس پر قابض نہیں ہو سکتا اور شاید یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر جرمن فوجوں نے اپنا رخ اب بجائے پیرس کے رو دو بار انگلستان کی طرف کر دیا ہے

آپ نقشہ اٹھا کر دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ اس وقت بلجیم اور فرانس کے مشرق میں جنگ ہو رہی ہے اور ساحل کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ بندرگاہ بولون پر جرمنی کا قبضہ ہو گیا ہے اور کیلے پر بھی وہ قابض ہو جانے کا مدعی ہے جو فرانس کے مشرقی ساحل کی نہایت اہم اور زبردست قلعہ بند بندرگاہ ہے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جرمنی اس مہم میں نصف سے زیادہ کامیاب ہو چکا ہے اور اب وہ انگلستان کے نہ صرف ساحل بلکہ اندرونی شہروں پر بھی بمباری کرے گا اور رو دو بار انگلستان کو انگریزی و فرانسیسی جہازوں کے ناقابل گزر بنادے گا لیکن اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سب کچھ ہو بھی جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ کیا ہٹلر انگلستان کو فتح کر لے گا، کیا وہ فرانس اور بلجیم کے مشرقی سواحل کو اپنی حکومت میں شامل کر سکے گا، کیا وہ اتحادین کو اس طرح صلح پر مجبور کر دے گا؟

ان تینوں باتوں کا جواب صرف اس سوال پر منحصر ہے کہ کیا نازی حکومت جنگ کے اس دباؤ کو عرصہ تک برداشت کر سکتی ہے اور کیا جرمن قوم اس فشار سے تنگ آکر گزشتہ جنگ کی طرح کسی اور انقلاب کا مطالبہ تو نہ کرے گی؟ اس سلسلہ میں اٹلی اور روس کے میلان کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اٹلی اتحادین کے خلاف ہٹلر جنگ کے لئے طیار معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مشکل ہی سے اپنے آپ کو اس آگ میں ڈالے گا

مسوئینی حد درجہ زمانہ شناس انسان ہے اور اس کی پالیسی صرف یہ ہے کہ جرمنی اور اتحادین میں سے جسکو بھی شکست ہو اس کا کوئی حصہ نوچ کھسوٹ کر فائدہ اٹھالے۔ وہ ہٹلر کا دوست ہے، نہ برطانیہ کا دشمن۔ وہ اگر نازی حکومت کا ساتھ دے گا تو صرف اسی وقت جب اُسے جرمن افواج کی کامیابی کا یقین ہو جائے گا، اور ہٹلر کی مخالفت پر طیار ہو جائے گا اگر اسے اتحادین کا پلہ بھاری نظر آیا۔ علاوہ اس کے جاہ وقوع کے لحاظ سے اس کا اکثر حصہ بحری حملہ کی زد میں ہے اور ہر چند اُس کی بحری قوت بُری نہیں ہے، لیکن اتحادین کی بحری قوت کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں، علاوہ اس کے اٹلی کے لئے ایک بڑا خطرہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ جنگ میں شریک ہو گیا تو اس کی افریقی نوآبادیاں روم سے بالکل منقطع ہو جائیں گی۔ افریقہ میں وہ لیبیا کی طرف سے مصر کی طرف

ضرور بڑھ سکتا ہے، لیکن اول تو سرحد لبیا کے مشرق کی طرف جو وسیع ریگستان پایا جاتا ہے وہی اُس کے اقدام کو روکے گا، دوسرے مصری و اتحادی افواج کا زبردست اجتماع جو مصر کی سرحد پر پایا جاتا ہے، اٹلی کو اس ارادہ سے باز رکھنے کے لئے کافی ہے۔ الغرض اٹلی کا اس جنگ میں کوئی ایسا حصہ لینا جس سے نازی حکومت کو مدد ملے، دشوار معلوم ہوتا ہے

روس کی پالیسی بھی بہت کچھ اٹلی سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ جرمنی کی فوجی اعانت پر تیار ہے اور نہ ہٹلر کے اشارہ پر کوئی اور نیا محاذ اتحادین کے خلاف قائم کر سکتا ہے۔ وہ بھی لڑائی کا رنگ دیکھ رہا ہے اور جرمنی کی فتح و شکست دونوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اگر جرمنی کو شکست ہوئی تو اس کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہو کہ بالشویت کا ایک نہایت سخت دشمن جو بالکل اس کے پہلو ہی میں ہر وقت خار بنا کھٹک رہا ہے رفع ہو جائے گا اور اسی کے ساتھ ملن ہے کہ جرمنی کا دوسرا انقلاب بالشویت ہی کی صورت میں نمودار ہو، اور اگر جرمنی کو کامیابی ہوئی تو پھر وہ اس سے ساز باز کر کے مشرق کی طرف بڑھنے کی کوشش کرے گا

بلقان کی سرزمین بیشک ایسی ہے کہ اگر وہاں جنگ شروع ہو گئی تو روس اور اٹلی دونوں کو اپنی خاموشی توڑنا پڑے گی، لیکن فی الحال اس کا کوئی امکان نہیں

بعض لوگوں کو حیرت ہے کہ جرمنی نے اس وقت تک بلقان کی طرف کیوں قدم نہیں اٹھایا، لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، کیونکہ جرمنی کے لئے سب سے زیادہ الجھن کی جگہ بلقان ہی ہے اور وہ اس وقت تک روس و اٹلی کے متضاد مفاد کو بلقان میں متحد نہیں کر سکا۔ جرمن اس وقت نہ اٹلی سے لڑائی مول لے سکتا ہے اور نہ روس سے، لیکن ان دونوں کا دوست رہنے کی حالت میں وہ بلقان کے مسئلہ کو کیونکر ان دونوں کی مرضی کے مطابق طے کر سکتا ہے، اس کا حل اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا، اس دوران میں ہٹلر نے بہت کوشش کی کہ روس و اٹلی کے درمیان سمجھوتے کی کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ یہ تینوں ملکر بلقان کو آپس میں تقسیم کر لیں، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی، علاوہ اس کے آغاز جنگ سے اتحادین کی طیاریاں بلقان میں اتنی زبردست پائی جاتی ہیں کہ جرمنی کو حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، مصر، فلسطین اور شام اس وقت ذخائر حرب کے لحاظ سے بڑی زبردست مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور ترکی و عراق کی فوجیں بھی جدید ترین آلات جنگ سے آراستہ ہیں، یہی حال مصر کی سرزمین و سواحل مصر کا ہے، جہاں علاوہ مصری افواج کے نیوزیلیینڈ اور ہندوستان کی فوجیں بھی ہر وقت مقابلہ کے لئے آمادہ و تیار ہیں

الغرض اس وقت نہ بلقان کا مسئلہ کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے، نہ اٹلی و روس کی پالیسی سے کسی مزید پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ موجودہ حالت میں جنگ کا فیصلہ تو فرانس و بلجیم کی سرزمین پر ہوتا نظر آتا ہے یا سواحل انگلستان پر

عربوں کی سیاسی بیداری

(سلسلہ)

۶۱۹ ۱۸ - ۶۱۹ ۱۲

(۲)

جنگ عظیم کے اعلان کے وقت کچنر (Kintener) اور رونالڈ اسٹورس (Ronald Stores) دونوں انگلستان میں اپنی تعطیلیں گزار رہے تھے۔ ان لوگوں کو فوراً مقررہ واپس کیا گیا لیکن وہ ابھی ڈوور (Dover) سے آگے نہیں بڑھے تھے کہ کچنر کو وزیر اعظم نے تار دیکر واپس بلا لیا اور فوراً وزیر جنگ کے عہدہ پر مامور کیا۔ اسٹورس تنہا مقررہ واپس گیا۔ اُس نے کچنر کو ایک پرائیوٹ خط میں لکھا تھا:

”کیا آپ مجھ کو اجازت دیں گے کہ میں اپنے طور پر دریافت کروں کہ اگر ترکی نے جنگ میں شرکت کی اور جرمنی کا

ساتھ دیا تو اس وقت اہل عرب کو کنسی راہ عمل اختیار کریں گے؟“

کچنر نے اس کا جواب بذریعہ تار اثبات میں دیا۔ اسٹورس نے فوراً ایک مصری (علی آفندی) کو خط لیکر عبداللہ کے پاس روانہ کیا۔ اس سلسلہ میں اُس نے پوری رازداری اور احتیاط برتی۔ ستمبر کی آخری تاریخوں تک علی آفندی عبداللہ کا جواب لیکر واپس آگیا۔

اس خط کو دیکھ کر شریف حسین عجیب شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ اس وقت اُس کے سامنے دو راہیں تھیں۔ ایک یہ کہ اس مصیبت کے وقت ترکوں کا ساتھ دیکر ترکوں کا تشکر حاصل کیا جائے، دوسرے یہ کہ تلوار ہاتھ میں لیکر قومی آزادی کے لئے عظیم بغاوت بلند کیا جائے۔ شریف حسین نے اپنے دونوں بیٹوں سے مشورہ کیا۔ دونوں کی دو مختلف راہیں تھیں فیصل کا خیال تھا کہ پہلی راہ زیادہ بہتر ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ فرانس شام پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور برطانیہ کا مفاد عراق کے جنوبی علاقہ سے وابستہ ہے۔ اُس کو یہ بھی غلط فہمی تھی کہ ملک بغاوت کے لئے آمادہ نہیں ہے، لیکن اس غلط فہمی

کی وجہ یہ تھی کہ اُس کو ملک کی کسی خفیہ جماعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عبداللہ کا خیال اس کے بالکل برعکس تھا، اسکو ملک کی تمام خفیہ جماعتوں سے کئی واقفیت تھی اور ملک کی سب سے زیادہ اہم اور پورا پورا احساس تھا۔ اُس کا مشورہ تھا کہ کچھ کو کوئی واضح جواب نہ دیا جائے اور خط و کتابت کا بھی سلسلہ برابر جاری رکھنا جائے اور اس چیز کو بالکل یقین کر لیا جائے کہ جنگ کے اختتام پر عرب ممالک بالکل آزاد ہوں گے۔ شریف حسین نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا۔ شریف حسین نے کچھ لکھا کہ برطانیہ کے ساتھ دوستانہ روابط پیدا کرنے کے لئے ہر وقت مستعد ہے، لیکن اُس کا موجودہ شریف مکہ کا عہدہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کھلم کھلا برطانیہ کا ساتھ دے۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے یہ بھی لکھا کہ اگر ترکوں نے جنگ میں شرکت کی تو اس حالت میں وہ اپنے حجازی ساتھیوں کو آادہ بغاوت کر سکتا ہے، بشرطیکہ برطانیہ اس کی پوری حمایت و سرپرستی کا وعدہ کرے۔ شریف حسین نے بڑی پرکاری کے ساتھ صرف حجاز کا ذکر کیا اور پورے عرب کے لئے کوئی وعدہ نہیں کیا۔

اسٹورس نے کچھ کو بذریعہ تار اس جواب سے مطلع کیا اور کچھ نے بھی تار ہی سے جواب کا مسودہ قاہرہ کی برطانوی ایجنسی کو روانہ کیا کہ عربی میں اُس کا ترجمہ شریف حسین کو روانہ کیا جائے۔ اس پیغام کی ابتداء ترکی کی شرکت جنگ کی خبر سے ہوتی ہے۔ اس میں اس کا پورا پورا وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر شریف حسین اور اس کے ساتھی انگلستان کا ساتھ دیں گے تو شریف حسین کے اسلامی عہدے اور اُس کے اعزہ کی بقاء و حفاظت کا برطانیہ ذمہ دار ہوگا۔ نیز اس کا بھی وعدہ کیا گیا کہ اگر عرب عام طور پر انگلستان کا ساتھ دیں گے تو انگلستان اُن کے مطالبہ آزادی کی بھی حمایت کرے گا۔ اس کے جواب میں عبداللہ نے لکھا کہ اُس کا باپ قطعاً برطانیہ کا دوست ہے اور وہ عربوں کو ترکوں کے خلاف آادہ بغاوت کرنے کے لئے بھی تیار ہے لیکن اس میں کچھ وقت صرف ہوگا۔ یہ جواب قاہرہ دسمبر کی ابتدائی تاریخوں میں پہنچا۔ یہ تھا عرب و برطانیہ کی سازش کا پہلا باب۔ جولائی ۱۹۴۷ء میں اس سلسلہ کی دوسری قسط شروع ہوئی۔ شریف حسین کو تمام عرب لیڈروں کے مفصل جوابات موصول ہوئے اور تمام گفت و شنید پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اب شریف حسین نے مہتری میک مان (Henry McMahon) کو ایک خط لکھا۔

ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیکر عربوں کو بھی یورپ کی سیاست میں لاکھڑا کیا۔ اس وقت عربوں کا رویہ اتحادیوں کے لئے عموماً اور برطانیہ کے لئے خصوصاً بھداہم تھا۔ شام و عراق میں ترکوں کا بہت کافی اثر تھا اور اس سے نہر سوئز اور بیس فاس میں برطانوی مفاد خطرہ میں تھا۔ دوسری طرف سیاسی میدان میں ایک اور مصیبت کا امکان تھا یعنی اگر سلطان نے جہاد کا اعلان کر دیا اور شریف حسین نے بحیثیت شریف مکہ اس کی تائید کی تو نہ صرف عرب بلکہ تمام غیر عرب مسلمان بھی جو اتحادی حکومتوں میں آباد ہیں مشتعل ہو جائیں گے۔

بالآخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سلطان نے جہاد کا اعلان کیا، پہلا فتویٰ شیخ الاسلام کے دستخط سے جاری ہوا، جس میں تمام عالم کے مسلمانوں کو اتحادیوں کے خلاف دعوت، جہاد دی گئی اور فراتس، دانیگلتان کے مقبوضات میں آباد ہونے والے مسلمانوں سے خاص طور پر اپیل کی گئی۔ مبلغین اور مقررین مسلمانوں کو آمادہ جہاد کرنے کے لئے اسلامی ممالک میں روانہ کئے گئے۔

شریف حسین بڑی احتیاط کے ساتھ مکہ میں بیٹھا ہوا اپنے لئے راہ صاف کر رہا تھا۔ سلطان کا جہاد نامہ اور کچر کا جواب دونوں شریف حسین کے پاس ساتھ ساتھ پہنچے۔ چند روز تو وہ بالکل خاموش رہا مگر اس عرصہ میں اُس نے پاس برابر سلطان کے تار پر تار آرہے تھے کہ وہ جلد سے جلد جہاد کی تائید پر زور انداز میں شروع کرے۔ بالآخر اُس نے سلطان کو لکھا کہ اُس کا خاموش رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ برطانیہ کا جنگی بیڑا بحر احمر میں موجود ہے۔ ادھر اُس نے جہاد کی تائید کی ادھر انگریزوں نے حجاز میں رسد کی درآمد روکی اور اگر یہ ہوا تو یہاں سخت قحط سالی ہو جائے گی اور اُس کے نتائج بغاوت کی صورت میں رونما ہوں گے۔ اس کے علاوہ خطرہ اس کا بھی ہے کہ انگریز حجاز پر گولہ باری نہ کر دیں۔

سلطان اور اُس کے ترکی وزیر شریف حسین کے اس گریز کو خوب سمجھ رہے تھے مگر ان لوگوں نے بھی اس وقت ٹال ہی جانا مناسب سمجھا۔ دوسری طرف شریف حسین نے بڑی احتیاط کے ساتھ ابن سعود، امام یحییٰ ادر اور یسی سے گفت و شنید شروع کی اور جہاد کے باب میں اپنی خاموشی کے صحیح وجوہ سے بھی اُن کو مطلع کیا۔ ترک بھی اس وقت پچلے بیٹھنے والے نہ تھے۔ انھوں نے درپردہ شریف حسین کو معطل کرنے کا ارادہ کر لیا چنانچہ دانی حجاز کو سلطان نے لکھا کہ وہ کسی طرح شریف حسین کو گرفتار کر لے مگر اس کا پورا انتظام کر لیا جائے کہ قبائل میں اس سے بغاوت نہ ہونے پائے چنانچہ شریف حسین کو بڑے خلوص کے ساتھ جمال پاشا نے دمشق آنے کی دعوت دی۔ شریف حسین بھی خوب سمجھ رہا تھا کہ اس دعوت کے کیا معنی ہیں۔ دوسری طرف ترکوں نے عربوں کو یوں دھوکا دیا کہ شریف مکہ نے جہاد کی تائید کی ہے۔ ہر جمعہ کو بعد نماز شام عراق میں خطیب پر زور انداز میں اس کا اعلان کرتے کہ شریف حسین نے جہاد کی تائید کی ہے۔ اخبارات میں بھی اسی قسم کی خبریں شائع کی جاتیں۔ ذیل میں اخباری پر و پندے کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو بیروت کے اخبار "الاتحاد العثماني" کی اشاعت مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۷ء میں موجود ہے۔

"ایک سرکاری اطلاع کے مطابق کل ہم نے یہ اعلان کیا تھا کہ شریف مکہ کے بیٹے امیر عبداللہ نے حجاز کے لاتعداد قبائلیوں کے ساتھ جہاد کے لئے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ آج ہم کو یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ شریف مکہ نے سلطان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حجاز میں جہاد کا اعلان کیا ہے اور اُس کے جواب میں اہل حجاز جوق در جوق جہاد کے لئے مسلح چلے آ رہے ہیں۔"

عراق میں بہت سے شیعہ اور سنی علماء کی خدمات جہاد کے پروگنڈے کے لئے حاصل کی گئیں۔ نجف اور کربلا میں امام حسین کی تلوار اور حضرت عباس کے علم ترغیب جہاد کے لئے نکالے گئے۔ یہ سلسلہ صرف عربی ممالک تک محدود نہ رہا بلکہ سوڈان، وادی نیل اور دوسرے مسلمان ملکوں میں بھی یہ تبلیغ کی گئی۔

شریف حسین کو اوائل جنوری ۱۹۵۷ء میں دمشق کی خفیہ انجمن کا پیغام اُس کے ایک باڈی گارڈ کی وساطت سے پہونچا۔ پیامبر نے شریف حسین کے کان میں چپکے سے پیام کہا۔ مگر شریف حسین نے اس کو اس طرح سنا کہ گویا اُس نے سنا ہی نہیں کیونکہ اس نے باڈی گارڈ پر اُس کو پورا اعتماد نہ تھا۔ دوسری طرف شریف حسین گورنر حجاز کے رویہ کو مشکوک نظر دل سے دیکھ رہا تھا، چنانچہ اُس نے اپنا ایک معتد جاسوس اُس کے پیچھے لگا دیا۔ جمال پاشا گورنر حجاز ابتداءً فردری ۱۹۵۷ء میں مکہ کا سفر کر رہے تھے کہ اتفاقاً اُن کے اسباب سے ایک ٹرنگ غائب ہو گیا جس میں اہم کاغذات تھے اور وہ ٹرنگ شریف حسین کے پاس پہونچ گیا۔ اب شریف حسین کو اُس گہری سازش کا علم ہوا جو اُس کے خلاف کی جا رہی تھی اُس نے فوراً وزیر اعظم کو تار دیا کہ کچھ اہم گفتگو کے لئے وہ اپنے بڑے لڑکے کو وزیر اعظم کی خدمت میں روانہ کرنا چاہتا ہے، کیا وہ اس کی اجازت دیں گے؟ اس کا جواب فوراً اثبات میں آیا۔ کئی دن تک سکھانے پڑھانے کے بعد شریف حسین نے فیصل کو روانہ کیا اور یہ بھی ہدایت کی کہ دمشق میں تمام لیڈروں سے بھی مل کر گفت و شنید کرے۔ چنانچہ فیصل مکہ سے روانہ ہو کر ۲۶ مارچ ۱۹۵۷ء کو دمشق پہونچا جہاں چار ہفتے تک اُس کا قیام رہا۔ عرب کی قومی تحریک کے لیڈروں سے وہ ملا خفیہ چمنوں کے کارکن بھی اُس سے ملنے آئے اور اپنا نقطہ خیال وضاحت کے ساتھ اُس کے سامنے رکھا۔ اُس نے بھی دل کھول کر ان لوگوں سے گفتگو کی اور بتلایا کہ وہ ترکوں کا ساتھ صرف اس خیال سے دینا چاہتا ہے کہ یورپ کی طاقتیں عرب پر دانت جمائے ہیں۔ دمشق کی خفیہ انجمن الفتاۃ کے ممبروں کا بھی یہی خیال تھا چنانچہ جب ترکی نے اپنی شرکت جنگ کا اعلان کیا تو اس انجمن نے ایک تجویز اپنے ایک جلسہ میں پاس کی تھی جو حسب ذیل ہے:

”حکومت ترکیہ کی شرکت جنگ نے عرب صوبوں کو سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس موقع پر عرب کو آزاد کرنے کی

ہر امکانی کوشش ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس جلسہ کی یہ بھی تجویز ہے کہ اگر موجودہ حالات سے

فائدہ اٹھا کر یورپ کی حکومتیں اپنے دیرینہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہیں تو اُس حالت میں ترکوں کا ساتھ دیکر

غیر ملکی مداخلت کا سد باب کیا جائے۔“

فیصل اور خفیہ انجمن الفتاۃ کے ممبروں کی ہم خیالی نے فیصل کو اُس کا باضابطہ ممبر بنا دیا۔ یورپ کی حکومتوں

کی طرف سے مداخلت کا خطرہ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ خصوصاً جب سے لیپیا (Libya) پر اطالیہ کا تسلط ہوا تھا

عرب اس خطرہ کو بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ آزادی کے خواہش مند تھے اور کسی قیمت پر بھی ترکوں کے بعد یورپ کی

غلامی قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔ فیصل نے الفتاۃ کی باضابطہ نمبری کے بعد کچھ اور امیر عبداللہ کی خط و کتابت کا حال

تفصیل کے ساتھ ان لوگوں کو بتایا اور اپنے باپ کے ارادوں سے آگاہ کیا۔

قسطنطنیہ پہنچ کر فیصل نے سعید حلیم پاشا، طلعت بے اور انور پاشا سے ملاقات کی خود سلطان نے بھی شرف باریابی عطا کیا۔ ان سب لوگوں نے ظاہر بڑی ہمدردی کے ساتھ اس کے باپ کے معاملات سننے لیکن آخر میں سب نے یہی جواب دیا کہ ان کا علاج خود شریف حسین کے ہاتھ میں ہے۔ ۲۳ مئی ۱۹۴۷ء کو فیصل واپس دمشق پہنچا۔ الفتاۃ نے اس عرصہ میں ایک اسکیم مرتب کی تھی جس میں برطانیہ کے ساتھ معاہدہ کرنے کے لئے ایک خاکہ تیار کیا گیا تھا۔ کچر اور شریف حسین کے درمیان جو باتیں طے ہو چکی تھیں ان کے علاوہ صرف دو قابل ذکر باتوں کا اس اسکیم میں اضافہ کیا گیا تھا۔ اول تو یہ کہ اس اسکیم میں تفصیل کے ساتھ آنے والی عرب حکومت کے حدود پیش کئے گئے تھے۔ دوم یہ کہ برطانیہ کو اقتصادی ترجیح دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ اسکیم الفتاۃ والوں نے شریف حسین کو دینے کے لئے فیصل کے حوالہ کی اور اس کی جزئیات اچھی طرح سمجھا دیں نیز یہ بھی واضح کر دیا کہ عرب تحریک کے لیڈر صرف انھیں شرائط پر برطانیہ کے ساتھ اتحاد کر سکتے ہیں۔ شریف حسین نے ان شرائط کو برطانیہ کے پاس روانہ تو کر دیا مگر وہ اپنی جگہ پر سمجھ رہا تھا کہ یہ شرائط انگلستان کے لئے شاید ہی قابل قبول ہوں لیکن اُس کا خیال تھا کہ ان شرائط سے کم پر بغاوت کرنا حماقت ہے۔

اسٹورس نے ان عرب لیڈروں سے بھی تبادلہ خیال کیا جو مصر میں مقیم تھے۔ دوران گفتگو میں اُس نے کچر اور عبداللہ کی خط و کتابت کا بھی ذکر کیا۔ آخر میں اسٹورس نے یہ بھی اشارہ کیا کہ عرب کا مستقبل صرف برطانیہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ عرب لیڈروں سے گفتگو کا نتیجہ یہ تو کم از کم ضرور ہوا کہ برطانوی افسروں کو اس کا یقین ہو گیا کہ عرب صرف خالی حوالی وعدوں سے خوش نہیں ہو سکتے۔ اس گفتگو کے بعد برطانوی کابینہ نے ہنری میک مان کو ایک بیان شائع کرنے کی اجازت دی۔ مگر اس بیان میں عرب مطالبات کو پورا کرنے کے وعدہ سے زیادہ مسلمانوں کے اُن شکوک کو دور کرنیکی کوشش کی گئی تھی جو انگلستان کی طرف سے اُن کے دلوں میں پیدا ہو گئے تھے جہاں تک عرب مطالبات کا تعلق ہو اس کا وعدہ کیا گیا کہ اختتام جنگ پر عرب کو آزاد ملک تسلیم کیا جائے گا، مقامات مقدسہ پر عربوں کو پورے اختیار حاصل ہوں گے اور عرب خلافت کے اسلان کو انگلستان خوش آمدید کہیگا۔ یہ اعلان جون کے پہلے ہفتہ میں کیا گیا اور اُس کی اشاعت تمام اسلامی ممالک میں ہوئی۔ عرب آبادیوں پر ہوائی جہاز سے ان اشتہارات کی بارش کی گئی۔ حکومت ہند بھی عرب جزیرہ نما کو بڑی تشویش کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جہاں تک عرب سیاست کا تعلق ہے یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اُس سلسلہ میں تمام انتظامات و ہائٹ ہال (White Hall) نہیں بلکہ دہلی کی حکومت کر رہی تھی۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں بھرہ پر قبضہ کرنے کی اسکیم بھی حکومت دہلی کے دماغ میں آئی تھی۔ حکومت ہند نے اپنے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کا ایک آدمی ابن سعود کو ہمارا کرنے کے لئے روانہ کیا۔ ابن سعود کو ترکوں سے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی، اور ترکی کی شرکت جنگ کے ساتھ دمشق کی خفیہ انجمن نے اپنا ایک آدمی مخصوص ابن سعود

کے پاس بھیجا تھا اور ابن سعود نے اس کی اچھی طرح آؤ بھگت بھی کی تھی۔ لیکن اسوقت اس کی پوزیشن بید نازک تھی۔ جہاں تک جہاد کا تعلق تھا، شریف مکہ کی حمایت جہاد کے بعد وہابی سردار ہونے کی حیثیت سے اُس کو بھی فوراً اس کی تائید کرنی چاہئے تھی۔ لیکن حکومت ہند کا نامہ برا بھی ابن سعود کے پاس پہنچا ہی تھا کہ شریف حسین کا بھی ایک پیامبر آگیا جس سے معلوم ہوا کہ شریف حسین نے جہاد کی تائید نہیں کی ہے۔ ابن سعود نے شریف حسین کی جہاد کی حمایت کے باب میں خاموشی کی پالیسی کو پسند کیا۔ نیز اس کا بھی یقین دلایا کہ ترک اگر نجد سے امداد کے متوقع ہوں تو یہ اُن کی حماقت ہے۔ دوسری طرف حکومت ہند سے بھی ابن سعود نے معاہدہ اتحاد کر لیا۔ اسی طرح کا ایک معاہدہ حکومت ہند نے ادریسوں سے بھی کیا اگرچہ اُس کی تمام تر حیثیت مقامی تھی اور عرب کی قومی تحریک سے اُسکو کوئی واسطہ نہ تھا۔

شریف حسین اور مہتری میک مان کے مابین جو گفت و شنید شروع ہوئی تھی وہ بھی کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی اور طرفین اُس طرف سے مطمئن ہو گئے۔ اس سلسلہ میں شریف حسین اور میک مان نے ایک دوسرے کو آٹھ خطوط لکھے اور یہ خط و کتابت ”میک مان خط و کتابت“ (Mc Mahon Correspondence) کے نام سے مشہور ہے۔ معاہدہ کی اہم دفعات کا بہ آسانی خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک عسکری نقل و حرکت کا تعلق ہے اس کا تفصیل کے ساتھ اُن خطوط میں کوئی ذکر نہیں ہے کیونکہ اُس کے متعلق شریف حسین کے پیامبر سے زبانی گفتگو ہوئی تھی۔ معاہدہ کا سیاسی رخ یہ تھا کہ شریف حسین نے عرب بغاوت کے اعلان اور ترکوں کو دشمن اسلام گرداننے کا اپنے کو پابند کر لیا تھا۔ دوسری طرف برطانیہ پر بھی دو پابندیاں عاید ہوتی تھیں اول تو یہ کہ اگر عرب خلافت کا اعلان کیا جائے تو وہ اُس کو تسلیم کرے اور ثانیاً یہ کہ مجوزہ حدود میں عرب کی آزادی کو تسلیم کرے اور اُس کو برقرار رکھے۔ عرب حکومت کے تعین حدود کا مسئلہ شروع میں مابہ النزاع بن گیا تھا۔ شام کا وہ علاقہ جو آج برطانیہ کے انتداب میں ہے (یعنی فلسطین کا علاقہ) خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ پیچیدہ ہو گیا اور گفت و شنید نے نازک صورت اختیار کر لی۔ اسوقت تو کسی نہ کسی طرح معاملہ طے ہو گیا مگر آج اُسی چیز نے اندوہناک شکل اختیار کر لی ہے۔ عربوں کا خیال ہے کہ مجوزہ حدود میں فلسطین کا علاقہ شامل ہے۔ بر خلاف اس کے برطانیہ کا بیان ہے کہ فلسطین کا تعلق اُس علاقہ سے ہے جس کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ یہ بڑی دلچسپ داستان ہے جب شریف حسین نے عرب حکومت کے حدود تفصیل کے ساتھ پیش کئے تو پہلے میک مان نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ ”اس مسئلہ کے متعلق گفتگو بعد میں کی جائیگی“ لیکن جب شریف حسین نے لکھا کہ:

”عربوں کے مطالبات بنیادی اور اقتصادی اعتبار سے سید اہم ہیں۔۔۔۔۔ انھیں (مطالبات) پر ہماری

اُس نے اُن کو کوئی اہمیت نہ دی اور ان دستاویزوں سے جن لوگوں کو تعلق تھا اُن سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ لیکن جو کہ جمال پاشا نے اراداً اس چیز کو نظر انداز کیا ہو۔ کیونکہ اگر اُن لوگوں کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی کی جاتی تو ملک میں ہنگامہ ہو جاتا، کیونکہ اس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی عموماً ملک میں اور خصوصاً مسلمانوں میں بید عزت و تعظیم کی جاتی۔ وہ سیاسی لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ دینی پیشوا بھی تھے۔ مگر حالات اس تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے کہ جمال پاشا کے لئے خاموش بیٹھنا محال ہو گیا۔ ملک میں عام طور سے انگریزی اور فرانسیسی ایجنٹوں کی موجودگی کی خبریں برابر موصول ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف فوجوں میں انقلابی خیالات کی تبلیغ زوروں کے ساتھ شروع ہو گئی تھی۔ ان اطلاعات نے اُن دستاویزوں کی اہمیت بہت بڑھادی جو فرانسیسی سفارتخانوں سے برآمد ہوئی تھیں۔ اس موقع پر جمال پاشا پر ایک بوکھلاہٹ سی طاری ہو گئی۔ وہ تمام لوگ جن کے نام اُن دستاویزوں میں موجود تھے، ان کے نام وارنٹ جاری کر دئے گئے۔ یہ سب کے سب ملک کی خفیہ انجمنوں کے روت رواں تھے بہت لوگ بھاگ گئے اور کچھ گرفتار ہوئے، اُن کو فوجی عدالتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ تیرہ آدمیوں کو پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ پینتالیس آدمی جو اب تک گرفتار نہیں ہوئے تھے اُن کے بھی فیصلے کر دئے گئے۔ کچھ کو پھانسی کا اور کچھ کو قید کا حکم سنایا گیا۔ جو لوگ موجود تھے اُن کو ۲۱ اگست ۱۹۱۷ء کی صبح کو پھانسی دیدی گئی۔ ان میں ایک عیسائی اور باقی مسلمان تھے۔ فیصل جب دمشق پہنچا تو صورت حال بڑی حد تک امیدوں کے خلاف بدل چکی تھی۔ شریف حسین نے فیصل کو جمال پاشا کے حکم کی تعمیل کی آڑ لیکر بغاوت کے لئے میدان تیار کرنے اور عربوں میں باغیانہ خیالات کی اشاعت کے لئے دمشق بھیجا، اُس کے ساتھ چالیس آزمودہ کار باڈمی گارڈ تھے جو ہر وقت اپنی جان کو ہتھیلی پر لئے رہتے۔ یہاں پہنچنے کے بعد فیصل نے دیکھا کہ اس کے پرانے دوست جن میں بیشتر سرکاری فوج میں ملازم تھے اُن کا تبادلہ ہو چکا ہے اور اُن کی جگہ پر تمام ترک افسر موجود ہیں۔ دوسری طرف جو مقامی لوگ تھے وہ سب کے سب گرفتار ہو چکے تھے۔ فیصل بذات خود جمال پاشا سے ملا اور ان لوگوں کی وکالت پر زور الفاظ میں کی۔ شریف حسین نے بھی جمال پاشا اور وزیر اعظم کو تار دئے مگر ان سب کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بالآخر بائیس جوانوں اور بڑھوں کو پھانسی دیدی گئی۔ ان میں عبدالحمید الزہراوی بھی تھا جس نے پیرس کانفرنس کی صدارت کی تھی۔ جازف ہانی (Joseph Hani) جو عیسائی تھا اُس کو منظر عام پر پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ ان بائیس آدمیوں کی جماعت میں سترہ مسلمان اور پانچ عیسائی تھے۔ اس میں ایک اور دلچسپ بات ہوئی اور وہ یہ کہ ان لوگوں کے مقدمات کی سماعت تو ہوئی مگر حکم نہیں سنایا گیا جن لوگوں کے لئے پھانسی کی سزاجوزی کی گئی تھی اُن کو عین وقت پر اس کی اطلاع دی گئی اور عوام کو اس کی خبر اس وقت ہوئی جب پھانسی ہو چکی۔

فیصل کو یکایک اپنے باپ کا ایک پیغام موصول ہوا جس میں اُس کو فوراً واپس ہونے کی ہدایت کی گئی تھی کیونکہ بغاوت کے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ اب اس کے سامنے سوال یہ تھا کہ وہ مکہ کیونکر جائے کیونکہ دمشق سے اُس کی روانگی جمال پاشا کو بید مشکوک کر دیتی، اُس نے ایک صورت سوچی اور فوراً جمال پاشا سے ملنے گیا۔ اُسے جمال پاشا سے کہا کہ ابھی اُس کو اطلاع ملی ہے کہ اُس کے باپ نے جو سپاہی بھرتی کئے ہیں وہ مدینہ میں جمع ہو گئے ہیں اور روانہ ہونے کے لئے تیار ہیں۔ یہ باتیں اُس نے اس انداز میں کیں کہ جمال پاشا کو اُس کی سچائی میں کوئی شبہ نہ ہو سکا۔ کچھ دیر بعد ہر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے کہا کہ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ اس فوج کے ساتھ اُس کا کوئی بھائی بھی روانہ ہو؟ جمال پاشا نے اس کو صرف پسندیدہ نظروں ہی سے نہیں دیکھا بلکہ یہ تجویز بھی پیش کی کہ اُن کے ہمراہ خود فیصل آئے۔ چنانچہ فیصل فوراً مدینہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

مدینہ میں اُس کا بھائی علی پہلے سے موجود تھا جس کو برابر مفصل ہدایات موصول ہو رہی تھیں۔ ۲۴ مئی ۱۹۵۷ء کو شریف حسین نے علی کو ہدایت کی کہ اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور بغاوت کے لئے وہ کوئی تاریخ مقرر کر دے اور اطلاع دے۔ دونوں بھائیوں نے مشورہ کر کے ۵ جون اس کے لئے مقرر کی۔ علی نے تمام مقامی سرداروں کو بھی اسکی اطلاع دیدی۔

۵ جون کی صبح کو مدینہ میں آزادی کا اعلان کیا گیا۔ قبائلی سردار مدینہ کے جنوب و مشرق میں جمع تھے۔ دونوں بھائی اپنی سپاہ کو لیکر اُن سے جا ملے اور باضابطہ بغاوت شروع ہو گئی۔ مکہ میں بغاوت ۱۰ جون کو شروع ہوئی۔ وہاں ترکوں کی فوج زیادہ نہ تھی کیونکہ ترکی گورنر اور فوج کا ایک بڑا حصہ طائف منتقل ہو چکا تھا جہاں گرمیوں میں سرکاری دفاتر میں مع فوج کے منتقل ہو جایا کرتا تھا باغی فوجیں ترکوں کی بارک پر بری طرح ٹوٹ پڑیں۔ تین دن تک گھمسان کی لڑائی ہوئی بالآخر ترکی فوج کے ایک حصہ نے ہتھیار ڈال دئے لیکن قلعہ میں جو فوج موجود تھی اُس نے تین ہفتے تک مقابلہ کیا۔ اس عرصہ میں مصر سے انگریزی فوج امداد کے لئے پہنچ گئی جس نے لڑائی کا فیصلہ کر دیا۔

ترکی و جرمنی میں اس خبر نے بھل مچا دی اگرچہ ترکی حکومت برابر یہ اعلان کرتی رہی کہ یہ خبر دشمنوں نے اڑائی ہے اور عرب میں کہیں بھی کوئی بغاوت نہیں ہوئی۔ دوسری طرف حکومت نے شام میں پوری کوشش کی کہ وہاں بغاوت نہ شروع ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ۱۲۰ عرب لیڈروں کو گرفتار کر کے اناطولیہ جلا وطن کر دیا گیا اور پورے ملک میں مارشل لا جاری کیا گیا۔ لبنان کو جو حکومت خود اختیاری دی گئی تھی اُس کا بھی خاتمہ کر دیا گیا اور انتظامات کا تمام تر تعلق مرکزی حکومت سے ہو گیا۔ تشدد اس درجہ بڑھا کہ وہاں ہر طرف دہشت انگیزی کا دور دورہ ہو گیا۔ بدقسمتی سے عین اُسی زمانہ میں سخت قحط سالی ہوئی اُس نے صورت حالات کو بد سے بدتر کر دیا۔ حکومت نے باہر سے غلہ فراہم کرنے کا بھی کوئی انتظام نہ کیا۔ امریکہ کے قونصل جنرل نے اپنے ایک مراسلہ مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۵۷ء

میں لکھا تھا کہ:

”یہاں غریبوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ سڑکیں بھوکے بچوں اور بھوکے عورتوں سے پٹی پڑی ہیں۔۔۔ اور حکومت غریبوں کی مصیبت سے قطعاً لاپرواہی برت رہی ہے۔ امریکن ریڈ کراس سوسائٹی کو بھی حکومت اسکی اجازت دی گئی کہ وہی کچھ امداد

بہم پہنچائے۔ میں روزانہ شام کی تفریح کے وقت بلشرٹ مردوں کو سڑکوں پر پڑا دیکھتا ہوں۔“

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو گیا آگے چل کر اور زیادہ مصیبتیں شام پر نازل ہوئیں۔

بغادوت کے اعلان کا جزیرہ نمائے عرب پر خوشگوار اثر ہوا۔ صرف دو حکمران یعنی ابن الرشید اور امام امین تو باضابطہ ترکوں کے مددگار تھے اور باقی تمام سرداروں کو بغاوت سے ہمہ ردی تھی اور ان سب نے بغاوت کا استقبال کیا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو قوآت میں ایک دربار ہوا، ابن سعود امیر قوآت اور دوسرے ۵۰ سرداروں نے شرکت کی۔ ابن سعود نے اپنی پر مغز تقریر میں پورے حالات پر تبصرہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ خطابت کے اعتبار سے یہ بے نظیر تقریر تھی اُس نے دوران تقریر میں پر زور انداز میں عربوں سے اپیل کی کہ وہ سب اپنے ملک کی خاطر اسوقت انگلستان کا پورا ساتھ دیں۔ یہ تقریر آگ کی طرح تمام ملک کے طول وارض میں پھیل گئی۔

شریف حسین کی بادشاہت کا اعلان ۲ نومبر ۱۹۳۷ء کو کیا گیا۔ اُسی دن باضابطہ بیعت کی رسم ادا کی گئی اور اس کی اطلاع امیر عبداللہ نے تمام اتحادی حکومتوں کو بذریعہ تار دی۔ کیونکہ اسوقت وہ اپنے باپ کی عرب حکومت میں وزیر خارجہ کے عہدہ پر مامور تھا۔ اس خبر نے سب کو ایک حد تک پریشان کر دیا، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق یہ اعلان قبل از وقت تھا، اور اس اعلان نے ان کے لئے نئی مصیبتیں پیدا کر دی تھیں۔ اتحادی اس باب میں تائید سے گریز کر رہے تھے اور شاید وہ حق بجانب تھے۔ بہر حال یہاں پر بھی معاملہ طے ہو گیا اور شریف حسین کو صرف حجاز کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔

عثمانی سلطنت پر یورپ کی حکومتوں کے دانت یوں تو ہمیشہ سے تھے مگر ترکی کی شرکت جنگ نے ان کی خواہش کو اور بھی عیاں کر دیا۔ جنگ جوں جوں آگے بڑھتی گئی ان کو عثمانی سلطنت کی تقسیم کے امکانات قوی تر نظر آتے گئے۔ عبدالحمید کی تخت نشینی اور جنگ عظیم کی ابتدا کے درمیانی وقفہ میں عثمانی سلطنت کا معتد بہ حصہ اغیار کی دست برد کی نذر ہو چکا تھا۔ ایشیاء کوچک کا کافی زرخیز حصہ روس کے پاس جا چکا تھا۔ قبرص اور مصر پر انگلستان قابض تھا، تونسہ (Tunis) فرانس کے پاس، آلیپہ (Algeria) اطالیہ کے پاس اور بسینیہ (Bosnia) سربیا (Serbia) کے پاس، آسٹریا کے پاس جا چکے تھے۔ ترکوں کے جنگ میں شریک ہونے کے بعد روس نے قسطنطنیہ و باسفورس پر، فرانس شام پر اور برطانیہ عراق پر قابض ہونے کے آرزو مند تھے۔ چنانچہ روس، فرانس اور انگلستان

نے اس سلسلہ میں ایک معاہدہ کیا جو سالکس پی کاٹ (Treaty of Commerce) معاہدہ کے نام سے مشہور ہے۔ مارچ ۱۹۰۷ء میں گفت و شنید کی ابتدا ہوئی اور ۱۲ مئی ۱۹۰۷ء کو معاہدہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ یہ معاہدہ ایک عبرت انگیز دستاویز ہے جو صرف بدترین قسم کی حرص ہی کا آئینہ دار نہیں بلکہ حرص کے ساتھ ساتھ اس میں تشکیک کی بھی آمیزش ہے جس نے اس کو شرارت انگیز بھی بنا دیا ہے۔ نیز یہ معاہدہ دو طرفہ کارروائی کی بھی حیرت ناک مثال پیش کرتا ہے۔

روس، فرانس اور برطانیہ نے بڑی فیاضی کے ساتھ سلطان کی سلطنت آپس میں تقسیم کی۔ اس معاہدہ کی رو سے قسطنطنیہ اُس کے گرد و نواح کا تھوڑا سا علاقہ، باسفورس اور اناطولیہ کا ایک وسیع خطہ روس کے حصہ میں آیا۔ شام کا بیشتر علاقہ، اناطولیہ کا بقیہ حصہ، اور عراق میں موصل کا ضلع فرانس کو دیا گیا۔ شام کے انتہائی جنوب کی سرحد سے لیکر عراق تک کے درمیان کا علاقہ جس میں بغداد اور خلیج فارس سے لیکر فرانس کے حصہ کی سرحد تک کا درمیانی علاقہ شامل تھا، برطانیہ نے اپنے لئے مخصوص کیا۔ روس کو جو حصہ ملا اُس سے ہم کو کوئی بحث نہیں کیونکہ اسکو عرب سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن برطانیہ و فرانس کو شام و عراق کے حصے نے تھے جو عرب ممالک سے متعلق تھے فلسطین اور اُس کے گرد و نواح کا علاقہ ایسا تھا جس پر فرانس اور برطانیہ دونوں قابض ہونا چاہتے تھے۔ برطانیہ فلسطین کو فرانس کے حوالہ کرنا اپنے مفاد کے لئے مضرت سمجھ رہا تھا۔ بالآخر طے یہ پایا کہ فلسطین کے علاقہ میں ایک بین الاقوامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔

سالکس پیکاٹ (Treaty of Commerce) معاہدہ کا اولین مقصد جزیرہ نما عرب کو منقسم کر کے عرب اتحاد کی راہ میں غیر قطعی رکاوٹیں پیدا کرنا تھا۔ اس معاہدہ میں سب سے زیادہ قابل غور چیز یہ ہے کہ اس کی بنیادیں اس خیال پر قائم تھیں کہ عربوں سے وعدہ خلافت کی جائے۔ کیونکہ شریف حسین سے جو معاہدہ برطانیہ نے کیا تھا اُسکی دفعہ ۱ اور اس نئے معاہدہ کی دفعات بالکل ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ شریف حسین کو اس نئے معاہدہ کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ ۱۹۰۷ء کے اواخر میں عظیم الشان انقلاب روس میں ظہور پذیر ہوا اور بالشویک حکومت وہاں قائم ہوئی جس نے چند اہم دستاویزیں شائع کیں۔ ان میں سالکس پیکاٹ معاہدہ بھی تھا۔ ترکی حکومت نے جمال پاشا کی وساطت سے اس معاہدہ کی نقل مع ایک خط کے فیصل کو روانہ کی۔ اس خط میں صلح کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک اور کاغذ منسلک تھا جس میں صلح کی تجویز کا خاکہ تھا۔ جمال پاشا نے اپنے خط میں ایک سنجیدہ مسلمان کی حیثیت سے ایک مسلمان کو اپیل کی تھی اور بتلایا تھا کہ ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ اسلام کے دُعا کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی جان تک قربان کر دے۔ لیکن برخلاف اس کے شریف حسین نے عرب آزادی کے قریب میں آکر اسلام کے دشمنوں کا ساتھ دیا اور آخر میں شریف حسین کو دمشق آکر گفت و شنید کی دعوت دی گئی تھی۔

شریف حسین کو اس انکشاف نے پریشان تو ضرور کیا مگر اُس نے جمال پاشا کو صاف جواب دیدیا اور تلخی کے ساتھ اُس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ لیکن اُس نے یہ خط مع سائیکس پیکاٹ معاہدہ کے حکومت برطانیہ کو روانہ کیا اور اُس کے متعلق جواب طلب کیا۔ حکومت برطانیہ نے مناسب یہ سمجھا کہ تمام الزام ترکوں پر ڈال دیا جائے چنانچہ دفتر خارجہ نے اپنے جواب میں اس انکشاف حقیقت کو ترکوں کے فریب سے تعبیر کرتے ہوئے اُس کی تردید کر دی شریف حسین نے اسکو تسلیم کر لیا

انگریزوں نے اس کے علاوہ ایک اور معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ یہودیوں سے ہوا تھا اور اعلان بالفور (Balfour Declaration) کے نام سے مشہور ہے جس میں یہودیوں سے برطانیہ نے فلسطین کو انکا قومی وطن بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ شریف حسین سے جو معاہدہ کیا گیا تھا یہ موجودہ معاہدہ بھی اسکے بالکل برعکس تھا۔ یہ اعلان حسب ذیل تھا:

”ہر مجبئی کی حکومت فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی حمایت کرتی ہے نیز وہ اس مقصد کے حصول کی پوری کوشش بھی کرے گی۔ یہ بات اس سلسلہ میں اچھی طرح سمجھنی گئی ہے کہ کوئی ایسی چیز عمل میں نہ آئے گی جس سے فلسطین

کی غیر یہود آبادی کے شہری یا مذہبی حقوق کو کوئی نقصان پہنچے نیز وہ یہودیوں کو جو غیر مالک میں آباد ہیں ان کے حقوق اور سیاسی حیثیت پر بھی اسکا کوئی اثر نہ ہوگا“

انگلستان کے دفتر خارجہ سے یہ اعلان ۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو شریف حسین کے معاہدہ سے پورے دو سال بعد شائع ہوا۔ اتحادی عربوں میں اس اعلان نے قیامت برپا کر دی۔ سب سے پہلے یہ وحشت ناک خبر مصر پہنچی۔ وہاں کے عرب لیڈروں نے اسکے خلاف پرزور احتجاج کیا لیکن برطانیہ نے ان خبروں کی اشاعت بالکل روک دی اور اسکی پوری کوشش کی کہ بغاوت ختم نہ ہونے پائے۔ شریف حسین نے جب یہ سنا تو اسکے بھی چھکے چھوٹ گئے۔ اُس نے پھر انگریزوں سے جواب طلب کیا اور اُنکے جواب سے مطمئن ہو گیا۔ شریف حسین کو انگریزوں نے یہ یقین دلایا کہ فلسطین میں صرف اسقدر یہودی آباد ہوں گے کہ جس سے وہاں کے عربوں کی سیاسی و معیشتی زندگی غیر متوازن نہ ہونے پائے گی، مگر عرب قوم اور اُس کے لیڈر اس مرتبہ مطمئن نہ ہوئے اور برطانیہ کی نیک نیتی اُن کی نگاہوں میں شکوک ہو گئی

۱۹۱۷ء کے موسم بہاراں میں، سات عرب لیڈر جو قاترہ میں مقیم تھے ان لوگوں نے ایک بیان میموریل کی شکل میں مرتب کر کے برطانیہ کے دفتر خارجہ کو روانہ کیا۔ یہ بڑے بڑے عرب لیڈر تھے جن پر عرب قوم کو اعتماد تھا۔ اس بیان میں اتحادیوں کی پالیسی پر سختی کے ساتھ تنقید کرتے ہوئے برطانیہ کی نیک نیتی پر شبہ کا اظہار کیا گیا تھا اور اسکا مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ برطانیہ اس کا اعلان کر دے کہ مستقبل میں عرب ممالک کے ساتھ اس کی کیا پالیسی ہوگی۔ اس کا جواب ۱۶ مئی ۱۹۱۷ء کو باضابطہ موصول ہوا جو عرب بغاوت کے سلسلہ میں برطانیہ کا اہم ترین بیان ہے۔ اس میں واضح انداز سے سابقہ وعدوں کو دہرا کر ان کی تصدیق کی گئی۔ شام، عراق و فلسطین کے باب میں دو باتوں کا یقین دلایا گیا جو سچا اہم ہیں۔ اول تو یہ کہ ان ممالک کو ترک کی حکومت کی غلامی سے آزاد کرانے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے

اور کی جائے گی تاکہ وہ آزاد اور خود مختار ہوں۔ دوسرے یہ کہ اُن ممالک میں کوئی ایسی حکومت نہ ہوگی جو وہاں کے بسنے والوں کی مرضی کے خلاف ہو، یا درکھنا چاہئے کہ یہ وعدہ سرائیکس پیکاٹ معاہدہ کے افشاء اور بالظور اعلان کے بعد کیا گیا۔

اس باب کو ختم کرنے سے قبل ایک اور اعلان کا ذکر ضروری ہے جو انگریزی فرانسیسی اعلان کے نام سے مشہور ہے اور اختتام جنگ سے کچھ ہی زمانہ پیشتر شایع ہوا تھا۔ اس اعلان میں ہر دو حکومتوں نے مشرق میں اپنے جنگی مقاصد کو بیان کرتے ہوئے اس کا مکرر اظہار کیا کہ اُن کا مقصد عرب ممالک کو ترکوں کی غلامی سے نجات دلا کر قومی حکومت کا قیام ہے جو وہاں کے باشندوں کی خواہش کے عین مطابق ہوگی اور اُن کو کئی اختیارات حاصل ہوں گے۔ اس اعلان کا اختتام دونوں حکومتوں نے اپنی نیک نیتی کی قصیدہ خوانی پر کیا۔ اس اعلان کی عرب ممالک میں بے انتہا شاعت ہوئی۔

(باقی)

محمد عتیق صدیقی

ل۔ احمد صاحب کے افسانے

انشائے لطیف :- اردو ادب میں صاحب "لالہ رخ" کا نام محتاج تعارف نہیں اور افسانہ نویسی میں جو معیار ل۔ احمد صاحب نے پیش کیا ہو وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ انکا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیات کی بولتی تصویر اور اردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہو یہ چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو اگر سلاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذبات حسن و عشق کی صحیح نقاشی دیکھنا ہو اور ادب و شعریت کا ذوق ہو تو اس مجموعے کو دیکھئے، پونے تین سو صفحات - قیمت مجلد دو روپیہ۔

نعمات :- اس مجموعہ میں جناب ل۔ احمد صاحب کے ساتھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں، جسے نشر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ اردو کی لطافت و نفاست کا اندازہ کرنے کے لئے اس انتخاب کا دیکھنا از بس ضروری ہے۔ ۱۳۶ صفحے - قیمت مجلد ایک روپیہ۔

زندگی کے کھیل :- ل۔ احمد صاحب کی بارہ کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں معاشری خرابیوں اور فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویریں دکھی جاسکتی ہیں۔ ۱۵۰ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ۔

محبت کا فسانہ :- ایک طویل فسانہ ہے جس میں ل۔ احمد صاحب نے مسرت ازدواج سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل فسانہ ہے اور ہر باب میں معاشری و اخلاقی مسائل پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ۔

نیچر نگار - لکھنؤ

اردو مختصر افسانہ میں جدید میلانات

اردو مختصر افسانہ کے جدید میلانات سے بحث کرنے کے لئے لکھنؤ ریڈیو نے مجھے چنا ہے۔ یہ اچھا ہوا یا بُرا؟ فیصلہ کرنے میں شاید دیر لگے۔ لیکن اتنا تو آپ بھی میرے ساتھ مان لیجئے کہ میرے لئے یہ کام خاصا کٹھن اور اُلجھانے والا ہے۔ میرے راستہ میں یہ خیال رہ رہ کر زحمت پیدا کر رہا ہے کہ کوئی پندرہ سال تک میں خود بھی افسانہ لکھتا رہا ہوں جن میں اور کوئی میلان ہو یا نہ ہو کم سے کم اتنا تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ ان کا حجم یا مقدار کافی ہے اور ان کی طرف توجہ خواہ مخواہ بھٹک جاتی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں اور کوئی کیفیت اور تاثیر نہ بھی ہو تو وہ محض اپنے حجم یا مقدار سے اپنے سے متعلق دنیا پر اثر ڈالنے لگتی ہیں۔ ہاں تو میری اصل مشکل یہ ہے کہ ایک طرف تو میں خود یہ فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا کہ اردو افسانہ کو میں نے بھی کوئی فائدہ یا نقصان پہنچایا یا نہیں دوسری طرف میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس سنگین واقعہ کو بھول نہیں سکتا کہ میں نے بھی نہ صرف افسانہ لکھے ہیں بلکہ عمر کے پندرہ سال اسی میں کھودے ہیں۔ مگر بہر حال ----- یہ تو خود اپنا جرم اور اپنی کمزوری ہے۔ ریڈیو کے سرالزام کیوں تھوپے قبل اس کے کہ اردو یا کسی زبان کے مختصر افسانوں میں جدید میلانات کی طرف توجہ کی جائے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر افسانوں کا دور میں آنا اور داستانوں اور ناولوں کی جگہ لے لینا بجائے خود ایک نئی علامت ہے جو زندگی کے ایک نئے میلان کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ ”ہرچہ گیر یہ مختصر گیرید“ کا میلان ہے۔ یعنی جو کچھ ہو مختصر ہو یا مختصر پسند کا میلان اس وقت زندگی کے ہر شعبہ میں کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور صنعتی دور (Industrial Age) کے لازمی نتائج میں سے ہے۔ جس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت گھبراہٹ اور سراسیمگی ہے۔ اب ہم کو اتنی فرصت اور فراغت کہاں کہ ہم طوالت اور تفصیل کے متحمل ہو سکیں؟ بڑی داستانیں اور ضخیم اب ہم اُگتا جاتے ہیں۔

فرصتِ کار و بار شوق کسے !

ذوقِ نظارہٴ جمال کہاں !

اب ”شوق کی فراوانی“ کا سوال نہیں ہے۔ ”خصیتِ نظر“ کا سوال ہے۔

لیکن انسان کی زندگی کبھی اپنے کو مجبور تسلیم نہیں کرتی۔ بلکہ جب ایک طرف اپنے کو بند اور مجبور پاتی ہے تو کسی دوسری طرف راہ نکال لیتی ہے جو بعض اعتبار سے پہلی راہ سے بہتر ہوتی ہے۔ اسی ناول اور مختصر افسانے کے معاملے میں دیکھئے۔ مختصر افسانہ کی پیدائش کے اسباب جو کچھ بھی رہے ہوں آج وہ ایک مستقل فن ہے اور ناول کے فن سے زیادہ وقت طلب ہے۔ چند لطیف اور نازک اشاروں میں ایک پوری زندگی کا اندازہ دیدینا واقعی دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے جس کو کسی طرح آسان نہیں کہا جاسکتا۔

اُردو میں مختصر افسانہ نگاری کی عمر ابھی بہت کم ہے۔ ہندی صاحب مرحوم کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ ”ابھی کل کی چھو کری ہے“ لیکن اتنی ہی عمر میں اس کا رنگ روپ کافی نکل آیا ہے۔ اور ہماری نگاہیں اسکی طرف اٹھنے لگی ہیں۔ اُردو مختصر افسانے کی ابتداء پریم چند آنجہانی سے ہوتی ہے۔ یہ تو سرشار کے افسانہ آزاد میں جو ایک اچھا خاصا نگار خانہ (Picture Gallery) ہے مختصر افسانے کے بیج موجود تھے۔ لیکن اُردو میں جس شخص نے پہلے پہل اس کو ایک مستقل فن بنایا وہ پریم چند ہیں۔ پریم چند نے نہ صرف اُردو مختصر افسانے کی بنیاد ڈالی بلکہ اُردو افسانہ میں اس سماجی اور معاشرتی واقعیت (Social & Cultural Realism) کو مستحکم اور پائدار بنایا جس کی سست اور ناقص کوششیں اس سے پہلے نذیر احمد اپنے اصلاحی ناولوں میں اور سرشار اپنے مزاحیہ ناولوں میں کر چکے تھے۔ پریم چند کو اپنے فن کے لئے اشارے یقیناً سرشار سے ملے لیکن ان کا فن بہت جلد بالکل ان کا اپنا فن ہو گیا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت وہ بے لاگ خارجیت (Disinterested Objectivity)۔ جو ان سے پہلے اُردو کے کسی مصنف میں نہیں پائی جاتی تھی۔ انکے افسانے ہندوستان کی عام معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان کا انداز نہ نذیر احمد کی طرح اصلاحی ہوتا نہ سرشار کی طرح استہزائی (Satirical) خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ زندگی پر تبصرہ کرنا اور اس کے نئے پہلوؤں کو روشنی میں لاکر لوگوں کے اندر نئی بصیرتیں پیدا کرنا جس نے پہلی مرتبہ ہم کو سکھایا وہ پریم چند ہیں۔

پچھلے بیس کچھ بیس برس سے اُردو ادب اور بالخصوص اُردو افسانہ میں جو سماجی اور جمہوری میلان مستقل طور پر کام کر رہا ہے اور جو روز بروز بڑھتا گیا ہے اس کا اصل سبب تو وہ سماجی اور اقتصادی (Economic and Social) اثرات ہیں جو دور جدید کی نئی خصوصیات ہیں۔ لیکن پریم چند نے اس میلان کا پہلی مرتبہ اعلان کیا۔ موجودہ افسانہ نگاروں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو کسی نہ کسی حد تک پریم چند سے متاثر نہ ہوا ہو لیکن دو خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ سدرشن اور اعظم کرپوری، اعظم کرپوری پریم چند کے سچے شاگرد ہیں۔ دیہات کی عام زندگی اور اس کی تمام خصوصیات کو وہ بڑی مہارت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ بے لاگ اور غیر شخصی (Impersonal) خارجیت جو پریم چند کا خاص فن ہے اعظم کرپوری میں بھی کافی

پائی جاتی ہے۔ سدرشن کے راستہ میں ان کا اصلاحی میلان رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔

خارجی واقعیت کے ساتھ داخلی واقعیت (*Subjective Realism*) بھی جسکو نفسیاتی واقعیت (*Psychological Realism*) کہتے ہیں اُردو افسانہ میں ایک نیا عنصر ہے جس کو آئے ہوئے بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں ہوئے اس کے ابتدائی آثار نیاز فتحپوری میں ملتے ہیں۔ اُردو افسانہ کی جدید نسل نیاز کی اسی قدر مضمون ہے جتنی کہ پریم چند کی۔ نیاز نے اُردو مختصر افسانے کو کئی سمتوں سے متاثر کیا ہے۔ اُردو افسانے میں کردار (*Character*) اور فضا (*Atmosphere*) کا احساس پیدا کرنا اور واقعات سے زیادہ نفسیات کو اجاگر کرنا نیاز ہی کے قلم نے شروع کیا تھا۔ انھوں نے اُردو افسانے کو شخصیت اور کردار دئے اور اب سے دس بارہ سال پہلے ہمارے افسانوں میں انفرادیت (*Individualism*) کا جو زور تھا اس کے علم برداروں میں نیاز کا نام سب سے پہلے آتا ہے جن کے افسانے درمیانی طبقہ کے پڑھے اور تربیت یافتہ لوگوں کی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔

اب سے پندرہ سال پہلے اگر اُردو افسانہ کے عصری میلانات تب تب تب کرنا ہوتا تو یہ کام اس قدر دشوار نہ ہوتا جس قدر کہ اب ہو گیا ہے۔ اس وقت جو میلانات تھے وہ تعداد میں نسبتاً کم تھے اور اس قدر پیچیدہ اور باہم الجھے ہوئے نہ تھے۔ زیادہ تر غیر زبانوں کے افسانوں خصوصاً انگریزی، فرانسیسی اور روسی افسانوں سے متاثر ہو کر اُردو میں افسانے لکھے جا رہے تھے۔ ان میں کچھ تو سیدھے سادے ترجمے ہوتے تھے۔ ترجمہ کرنے والوں میں نیاز سجاد حیدر بلیدرم اور جلیل احمد قدوائی مستقل اور انفرادی (*Individual*) حیثیتوں

کے مالک ہیں۔ ان لوگوں نے ترکی۔ انگریزی۔ فرانسیسی اور روسی افسانوں سے جو ترجمے کئے ہیں وہ خاص درجہ کی چیزیں ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی افسانوں سے اثر قبول کر کے اُردو میں ایسے افسانہ کثرت کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور اب بھی لکھے جا رہے ہیں جو ترجمے نہیں کہے جاسکتے۔ بلکہ جن کو دوسری زبانوں سے اخذ کر کے ہندوستانی ماحول اور معاشرت کے سانچے میں ڈھال لیا گیا ہے۔ مافوق افسانوں کی ابتدا بھی نیاز ہی سے ہوتی ہے۔ ان کے بعد اسی قسم کے افسانوں کا ایک پورا دور آتا ہے جو ابھی تک جاری ہے۔

اب سے پہلے اُردو مختصر افسانوں کا مقصد اور ان کا موضوع عموماً رومانی (*Romantic*)

ہوتا تھا۔ محبت کا نیا نفسیاتی اور جنسی تصور اب تک اُردو میں مختصر افسانوں کا مرکزی خیال رہا ہے۔ اور ہم پندار کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ پچیس سال کے اندر اُردو افسانے محبت کے جیسے شاہکار پیدا کئے ہیں وہ اُردو ادب کی تاریخ میں کبھی بھولے نہیں جاسکتے۔ ان سے پہلے اُردو افسانہ میں جنسی آزادی بالکل مفقود تھی جنسی واقعیت کو عریانی اور بیجیانی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا تھا۔ عشقیہ ناولوں اور عشقیہ افسانوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن ان میں زیادہ تر

تو ایسے تھے جو ادب میں شمار کئے جانے کے قابل نہ تھے اور جو اس قابل تھے جن میں عشق و محبت کے جھوٹے جذبات جھوٹے پیرایہ میں پیش کئے جاتے تھے۔ میں اس کو جدید اُردو افسانے کے اہم کارناموں میں شمار کرتا ہوں کہ اس نے ہم کو عشق و محبت کے انسانی تصور سے آگاہ کیا اور ہمارے اندر صحیح اور صحت بخش جنسی شعور پیدا کیا۔ اس عشقیہ حقیقت نگاری کو عربی اور یحیائی کہئے یا کچھ اور اس میں بے عذوبیاں جتنی بھی ہوئی ہوں مگر اس سے ہم کو فائدہ بھی بہت ہوا ہے۔ معاشرت اور اخلاق کے غلط تصور اور جھوٹے معیار کو جھٹکے دے دیکر صحیح مرکز پر لے آنے میں اس سے کافی مدد ملی ہے۔ جنسی آزادی اور جنسی واقفیت کی دھن اُردو افسانہ میں اب تک نہ صرف جاری ہے بلکہ ترقی کر رہی ہے مگر اب تنہا یہی ایک میلان نہیں کام کر رہا ہے۔ زندگی اور ادب دونوں میں اس وقت بے شمار نئے میلانات پیدا ہو گئے ہیں جن میں سے اکثر اہم کئے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو شکست دینا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہماری زندگی میں جو توڑ مڑ پیدا ہو رہا ہے اور ہم جس تشنج اور بچہ بنی کے عالم سے گزر رہے ہیں اس کا عکس ہمارے تمام جسمانی اور دماغی حرکات و سکنات میں جھلکتا نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ ہمارے افسانوں میں بھی اس کے آثار ملتے ہیں جو عصری میلانات (Contemporary tendencies) اس وقت زندگی کے اور شعبوں میں کام کر رہے ہیں، اُردو افسانے میں بھی نمایاں ہیں۔ زندگی میں جو نئی قدریں اور نئے تصورات (پیدا ہو گئے ہیں)

ان میں سب سے زیادہ اہم وہ انسانی جذبہ ہے جس کو عربی زبان میں خلق دوستی (Philanthropy) کہنا چاہئے مگر جس کا نیا نام "جمہوریت" (Democracy) ہے۔ اب ہم مٹھی بھر آدمیوں کی زندگی کو زندگی نہیں سمجھتے۔ ہمارا دائرہ نظر پہلے سے بہت زیادہ وسیع ہو گیا ہے اور ہمارے سامنے بنی نوع انسان کی کثیر سے کثیر تعداد کی زندگی ہے۔ ہمارے اندر اجتماعی شعور (Social or Group Consciousness)

بڑھ رہا ہے چنانچہ اُردو افسانہ نگاروں کی نئی نسل خواص کی زندگی سے اپنے لئے مواد بہت کم لیتی ہے۔ زیادہ افسانے آجکل عوام کی عبرتناک زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آجکل کے افسانوں میں وہ فنی نزاکتیں اور وہ اسلوبی نفاسیتیں نہیں ہوتیں جو کلاسیکی ادب (Classical) کی امتیازی خصوصیات تھیں اور جن کی بدولت ادب ایک منتخب اور مخصوص گروہ کی ملکیت بنا رہتا تھا۔ اب ہمارے ادب کا اسلوب بھی جمہوری اور غیر انفرادی (Non individual) ہو رہا ہے۔ یہ بڑی اچھی علامت ہے اور اس سے ہم کو بڑی امیدیں ہیں۔

پچھلے دس بارہ سال کے اندر جتنے افسانے اُردو میں لکھے گئے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہیں جو محض تفریحی ہوں۔ بیشتر زندگی کی طرح سنگین ہیں اور زندگی کی نئی سمتوں اور نئے امکانات کا احساس پیدا کرنے کی کامیاب یا ناکامیاب کوشش کرتے ہیں۔ جدید افسانوں کا کوئی مجموعہ اٹھالیچے "منزل" "انوکھی مصیبت" "باسی پھول" "محبت اور نفرت" "داندو دام" "شعلے" "آتش پارے" "صنوبر کے سائے" ان میں سے کسی کو پڑھئے

آپ کو زندگی کی نئی سچیدگیوں کا احساس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جدید اُردو افسانے کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے اپنے کو اصلی زندگی سے بے تعلق نہیں رکھا۔ بلکہ اس کی سچی اور زندگی سے معمور تصویریں سامنے کر کے ہمارے اندر یہ شعور پیدا کیا کہ ہم کس نازک اور سخت مقام پر ہیں اور ابھی ہم کو کن کڑی منزلوں سے گزرنا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جن افسانوں کے ابھی نام گناے گئے ہیں اور جن میں سے اکثر نئے ادب کے نئے شاہکار ہیں ان میں کچھ ایسے نقص بھی ملتے ہیں جو شاق گزرتے ہیں۔ مثلاً بہت کم افسانے ہم کو ایسے ملتے ہیں جن میں تعمیری یا تخلیقی اشاروں (Constructive or creative suggestions) کی کمی نہ ہو۔ زندگی کے نئے ہیجان۔ اس کی نئی اُلجھنوں اور نئی کشاکشوں کو تو ہمارے نئے افسانہ نگار بڑے مزے سے اُبھار کر سامنے کر دیتے ہیں مگر اس سے آگے وہ خود مجنوں سے ہو جاتے ہیں اور ہم کو بھی مجنوں اور پیراگندہ چھوڑ دیتے ہیں اور ہم اپنے دل میں یہ سوال کرتے رہ جاتے ہیں کہ ”پھر؟“ یعنی انسانی معاشرت کی کوئی نئی تخیل پیش کرنے سے یہ لوگ قاصر رہ جاتے ہیں۔ اس کا سبب خارجیت کا وہ بڑھا ہوا سودا ہے جس میں نئی نسل کا ہر شخص مبتلا نظر آتا ہے اور جو انسانی زندگی کی اندرونی تدروں سے ہم کو بے خبر رکھتا ہے۔ خارجیت ہو یا دخلیت ہر چیز کی ایک صحیح مقدار اور ہر چیز کا ایک صحیح معیار ہوتا ہے اور اس میں افراط یا تفریط خرابی سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ سراسیمہ جو آج کل کے اکثر افسانہ نگاروں میں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص کچھ جھلایا ہوا سا معلوم ہوتا ہے اور اپنی جھلاہٹ کو چھپا نہیں سکتا۔ اگر زندگی پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اور اگر ادب اور ادب کی ایک شاخ ہونے کی حیثیت سے افسانہ زندگی کی تنقید ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اور ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ سے زندگی کے حالات اور اس کے رجحانات پر غور کریں اور نہ اپنے تعصبات کو راہ دیں اور نہ غم و غصہ کو جیسا کہ پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ جدید افسانہ نگاروں کی ایک خاصی تعداد اب بھی ایسی ہے جو رومانی یا عشقیہ افسانے لکھتی ہے۔ ان میں ایسوں کی کمی نہیں جو افسانے کو غزل کے قسم کی چیز بنائے رہنا چاہتے ہیں۔ یہ جماعت صرف حیات جنسی (عکس) کو کل زندگی تصور کرتی ہے اور اسی میں کھو کر رہ جاتا زندگی کا نہیں تو کم سے کم ادب کا اصلی مقصد سمجھتی ہے جنسی تجربہ (experience)۔ انسان کی زندگی کا نہایت اہم تجربہ ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے اس کے ساتھ اور بہت سے اہم اور سنگین تجربات انسانی زندگی کی ترکیب میں داخل ہیں۔ دنی اور کپڑے کی ضرورت بھی اسی زندگی کے تجربے ہیں۔ کسی ایک تجربہ کو اور تجربات سے جدا کر کے اس پر ضرورت اور حق سے زیادہ زور دینا حقیقت کی ایک بگڑی ہوئی تصویر پیش کرنا ہے۔ اس سے زندگی کا غلط اندازہ ہوتا ہے۔ آج کل اُردو کے عشقیہ افسانہ نگار عام طور سے یہی کر رہے ہیں وہ انفرادیت کی اس حد تک پہنچ گئے

ہیں جہاں پہونچ کر انسان صرف اپنے نفس میں کھویا ہوا جانور معلوم ہونے لگتا ہے۔ ایسی انفرادیت کے خلاف جہاد کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی کا ایک ناگوار رد عمل (Reaction) اور اسی کی ضد وہ عدم انفرادیت ہے جو اختطاری طور پر چارے ادیبوں اور بالخصوص فسانہ نگاروں میں پیدا ہو گئی اور جس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلوبی تنوع اور نزاکتوں سے جدید اُردو افسانہ بہت بڑی حد تک محروم ہو گیا ہے۔

آخر میں مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید اُردو افسانہ نے ہمارے ادب کو جو کچھ دیا ہے اس کا مرتبہ مسلم ہے اور اس سے کبھی انکار نہیں کیا جاسکے گا۔ ہماری زندگی میں جو نیا خمیر اُٹھ رہا ہے اس کی صحیح ناپزدگی کرنے میں اُردو افسانہ بہت بڑی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔ لیکن ابھی اس کو بہت کچھ ہونا اور بہت کچھ کرنا ہے جدید اُردو افسانہ ابھی تعمیری دور سے گزر رہا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ مکمل ہو کر اس کی صورت کیا ہو گی۔ ممکن ہے اور بہت کچھ امید ہے کہ جن خامیوں کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے وہ عارضی اور وقتی ہوں اور تعمیری دور کی لازمی خصوصیات۔ بہر حال اگر جدید اُردو افسانہ نے اعتدال کا راز معلوم کر لیا اور افراط اور تفریط دونوں سے بچ نکلنا سیکھ لیا تو وہ نہ صرف اس وقت دنیا کے جدید افسانوں سے آنکھیں ملانے کے قابل رہے گا بلکہ اس کا ایک تاریخی مرتبہ ہو گا جو ہر دور میں تسلیم کیا جائے گا۔

جنوں گورکھپوری

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علیحدہ علیحدہ خرید فرمائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ ہمیں:				
نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نہروپیہ
معرکہ سخن	مکتوبات نیاز	اُردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں ملجائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

میکسم گورکی اور سوویت ادب

۱۹۱۶ء کا انقلاب ہوا تو گورکی اپنی عمر کی سچاں منزلیں طے کر چکا تھا۔ انقلاب کا واقعہ اس کے ہم عصر قلم کی ادبیت کا سورج ڈوب جانے کا سبب ثابت ہوا، مگر گورکی کے لئے یہی واقعہ انقلاب غیر معمولی ولولہ تخلیق لے کر آیا۔ چنانچہ گزشتہ سترہ سال میں گورکی نہ صرف ایک افسانہ نویس کی حیثیت سے، نہ صرف سوویت ادب کی عظیم الشان تحریک کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے، بلکہ سوویت روس کے کلچری انقلاب میں صفت اول کے نظریاتی اور ناظم کی حیثیت سے بھی، جس قدر مصروف و مہمک رہا ہے اُس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔

عمر کی اُس منزل میں پہنچنے کے بعد، جب اکثر اہل قلم اپنے تذکرے لکھنے اور تصانیف کی نظر ثانی و اشاعت کے اہتمام میں لگ جاتے ہیں، وہ کیا چیز تھی جس نے گورکی کو ایسے انہماک اور کارکردگی پر آمادہ و مصروف کر دیا؟ اس کا جواب ڈھونڈھنے میں اس بات کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ کچھ پچاس تین صدیوں میں، اور موجودہ زمانہ میں، ایک بھی مثال موجود نہیں کہ ایک مصنف اپنے ملک کے ادب پر ایسا اقتدار حاصل کر سکا اور اتنا کامل حکمران رہا ہو جیسا گورکی کو حاصل ہے، اپنے وطن کے کلچر پر کسی ادب نے ایسا اثر ڈالا ہو جیسا گورکی نے ڈالا، اور وطن و بیرونی ممالک میں اتنی زبردست شہرت و مقبولیت حاصل کی ہو جیسی گورکی کو ملی۔ چنانچہ گورکی کی ادبی عظمت کی وجہ معلوم کرنا ہو تو گورکی کی پوری انقلابی و ادبی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

اُس زمانہ میں جب روس کی ادبی فضا پر اشراف اور بورژوا اہل قلم چھائے ہوئے تھے، گورکی نے ان کے خیالات کی مخالفت سے اپنی ادبی زندگی شروع کی اور دنیا کی "اشتراکی" آزادی کا عندیہ پیش کیا اُس کے گیتوں میں انقلابی جدوجہد کے مناظر، شخصی ملکیت کی ہولناکی اور سرمایہ داری کی بھیانک تصویریں پیش ہونے لگیں اُس کے شعروں میں انقلاب کے سیاہی کی عظمت اور بڑائی کا بیان ہونے لگا۔ اور جبکہ ٹالسٹائی چیخوف اور کرولیکو زندہ تھے اور دوستوفسکی کا اثر چھپا ہوا تھا، تو عمر گورکی نے ادب کے محاذ پر "پروتھاریا" کا پرچم لہرایا

دوستوں کی کہہ گیا تھا کہ ”مغزوہ شخص نرمی اختیار کر“

طالستانی کہہ رہا تھا کہ ”برائی کو مٹانے کے لئے بھی طاقت کا استعمال برا ہے“

چیخوف بتا رہا تھا کہ ”عاجزی سب سے بڑی عقلمندی ہے“

اور اشارت نگار (*Stary*) نوجوان لوگوں کو مابعد الطبیعیاتی یعنی ایک خیالی دنیا کی طرف

بلارہے تھے۔

عجز و تذلیل کی اس تعلیم کے خلاف، سماجی جدوجہد کی اس شاعرانہ گریز کے خلاف گورکی کے قلم سے نجات دلانے والے خود دار انسانوں کے مرقعے پیش ہونے لگے اور صرف اس حقیقت سے کہ گورکی نے شروع ہی سے ”انقلابی پروتاریا“ کا ایک عالمگیر فلسفہ پیش کر کے صاحب جائزاد طبقے کا وزن ہلکا کر دیا، سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ محض ایک افسانہ نویس ہی نہ تھا۔

”نکات فن“ (*Talks about Craft*) سنہ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی، جس میں گورکی نے اس بات کو خود بھی صاف کر دیا۔ لکھتا ہے:-

”ذاتی طور پر نہ مینے کبھی پہلے محسوس کیا اور نہ اب محسوس ہوتا ہے کہ میں کوئی خالص ادبی آدمی ہوں۔ میں عمر بھر

کسی نہ کسی اشتراکی (*کامنڈہک*) کام میں لگا رہا ہوں اور میرا یہ انہماک آج بھی اُسی طرح برقرار ہے“

گورکی کا یہ بیان ایک قسم کا انکسار ہے۔ کیونکہ اس کی ادبی مصروفیت اس کی ”سوشل“ مصروفیت سے جدا چیز نہیں اس کی ہر تحریر اسی ایک مقصد کے لئے ہوتی ہے۔

الحاصل، ادب کے میدان میں داخل ہو کر، گورکی بہت جلد ایک نئی تحریک کا لیڈر بن گیا۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں اُس نے ایک (*Almanac*) جاری کیا جس کا نام (*ZNANYE*) تھا۔ اس رسالہ نے آزاد خیال لکھنے والوں کا ایک حلقہ پیدا کر لیا اور اگرچہ یہ لکھنے والے جو سنہ ۱۹۰۵ء کے انقلاب پس ”انقلابی“ بن گئے تھے مگر جب رد عمل ہوا اور ”رجعتی“ طاقتیں ابھریں تو وہ بھی ”رجعتی“ ہو گئے، لیکن گورکی کا رسالہ انقلابی ادب کا پرچم بنا رہا۔ گورکی کا یہ ادارہ پروتاریا اہل قلم کے لئے ہی ایک اسکول نہ تھا بلکہ ذہین طبقے کے مصنفین میں اشتراکی شعور کو بیدار کر کے انہیں محنتی طبقے میں ملا دینے کا مدرسہ بھی تھا۔

(*Slotypin*) کے رجعتی زمانہ میں جب یاس و اسخطا ط نے ادب کو چھپا رکھا تھا اور خدا کی تلاش اور تصوف وغیرہ کے موضوعات ادب ہی کو بورژوائیوں نے مقصود ادب قرار دے رکھا تھا، ان حالات میں گورکی نے اپنے رسالہ میں اپنا ناول (*Mother*) اور ڈراما (*Enemy*) شائع ہو گئے۔

ان دونوں تصنیفوں کے اندر گورکی نے ان عوام کی حالت پیش کی ہے جو مولشیوں کی طرح ہانکے جانے والوں کی حیثیت کو چھوڑ کر آزادی دلانے والے ذی احساس و ذی شعور سپاہی بن رہے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف اگر اشتراک و بورژوا اہل قلم جمعی طاقتوں کے سامنے جھک کر ان کی مدح سرائی کر رہے تھے تو دوسری طرف گورکی کے بعد دیگرے اشتراکی و انقلابی کتابیں لکھ رہا تھا (اسکا فسانہ *Okruzhnaya Town* ناول *Life of M. Kozhemya Kuv* اور ڈراما *The Last* اسی زمانے کی تصانیف ہیں)۔ ان تمام تصانیف میں ”املاک“ والی دنیا کی ہیبت ناکیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور گورکی کے طنز نے زار کی حکومت کے کاسہ لیسوں کی خوب خبر لی ہے۔

جب *Andreyev, Slogunov* اور *Bely* اپنی تصانیف کے ذریعے سے یہ تعلیم دیر ہے تھے کہ انسان کی فطرت میں حیوانی عنصر لازمی جزو ہے، اس وقت گورکی کے کردار اس کا بطلان کر رہے تھے کہ فطرت انسان کی حیوانیت بنیادی چیز نہیں ہے۔ روسی زندگی کے بڑے بڑے مرقعے جو گورکی بنا رہا تھا ان سے ثابت ہو رہا تھا کہ انسانیت کا زوال اور انسانی مصیبت ”ملکیتی نظام“ اور انسان کے استحصال کا نتیجہ ہے۔

ناول و ڈراما کے علاوہ بکثرت مضامین شائع کر کے بھی گورکی ان رجحانات سے برابر جنگ کرتا رہا جو انقلابی مقاصد کے خلاف یا نقصان پہنچانے والے تھے۔ اور اسی کے ساتھ اُس نے نئے لکھنے والوں کی تربیت و ترقی پر بھی پوری توجہ صرف کی۔ مبتدی لکھنے والوں کی اور خاص کر ایسے انشا پردازوں کی جو کسان مزدور جماعتوں میں سے نکلے ہوں، گورکی حد درجہ خبر گیری کر رہا تھا۔

اس دور کے گزر جانے کے بعد گورکی نے اپنی ساری توجہ تین پہلوؤں پر مرکوز کر دی، افسانہ و ڈراما پر جو گہری حقیقت اور واقعیت نگارانہ اظہار کے سچے نمونے ہیں، مضمون نگاری پر جو رجعتی رجحانات کے خلاف اور اشتراکی زندگی میں شناختی پیدا ہونے کا سد باب کرتے تھے، اور نئی نسل کے انشا پردازوں کی تربیت و جوہر قابل ہمت افزائی پر کیونکہ گورکی نئی تحریک کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے ادب کے بے پناہ اثر سے واقف تھا۔ سوویت ادب میں گورکی کی زبردست شخصیت اور اہمیت انھیں تین طریقوں سے رونما ہوئی، اور انقلاب کے بعد بھی اُس نے انھیں طریقوں پر اپنا کام جاری رکھا۔ اور چونکہ انقلاب نے ادب کے لئے غیر معمولی امکانات پیدا کر دیئے تھے، اس لئے گورکی کی کوششیں انقلاب کے بعد بہت زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ پروتاریا ادب و کلچر کے مخالف اہل قلم اور نقادوں میں یہ خیال بہت مقبول ہے کہ جب توہیں گرجتی ہیں تو سر و شغبی چپ رہتا ہے، خاص کر اس صورت میں جب مقصدی طور پر یہ ثابت کرنا ضروری ہو کہ صناعت و انقلاب دونوں مختص (*exclusiv*) چیزیں ہیں۔

چنانچہ اس گمراہ کن عقیدے سے کہ صنعت انقلاب کی ضد ہے خود ایک سوویٹ نقاد متاثر ہو کر اس طرح استدلال کرنے لگا :-

”انقلاب کے وقت جذبہ عمل شدید ہوتا ہے اگر صناعت تخلیق مشاہدہ چاہتی ہے، یہی سبب ہے کہ اعلیٰ صنعت کے تمام نمونے امن و سکون ہی کے زمانوں میں وجود پذیر ہوتے ہیں۔“

ایک سوویٹ نقاد کے قلم سے اس قسم کا اظہار خیال ہو تو ظاہر ہے کہ نہ صرف وہ جماعت جو بورژوا ماضی کو خیر باد کہہ کر انقلابی بنی تھی بلکہ نوجوان پرولتاریا لکھنے والوں پر بھی اس کا اثر ہونا تھا، اور ہوا۔ چنانچہ انقلاب اکتوبر کے بعد ہی اول الذکر جماعت کی طرف سے یہ آوازیں بلند ہونے لگیں :-

”ہم شاعر و ادیب ہیں، ہمارا کام زندگی کا مشاہدہ کرنا اور پھر اپنے تاثرات کی تصویریں بنا کر پیش کرنا ہے! انقلاب ارادہ

عمل ہے، ارادہ مشاہدہ نہیں! اس لئے ہم انقلاب سے الگ رہ کر ہی تخلیقی کام کر سکتے ہیں۔۔۔ اس میں شریک ہو کر نہیں!“

اور نوجوان پرولتاریا یا انقلابی شاعر و مصنف اپنی صنعتی لغزشوں کا جواز اسی نظر سے نکالنے لگے :-

”اعلیٰ صنعت امن و سکون کے زمانے میں رونما ہوتی ہے۔ انقلاب کے دور میں کسی کو اپنے کام پر پالش کرنے کی بھی

تہمت نہیں ملتی۔ ایک عرصہ شعر اگر موزوں ہو بھی گیا تو اس کے بدلے میں کوئی انقلابی مورچہ سرور ہاتھ سے نکل گیا

ہوگا! اس لئے ہماری صنعت کامل نہیں ہو سکتی!“

لیکن گورکی نے اپنی صناعت مشق و عمل سے ان تمام مابعد الطبیعیاتی نظریوں کو غلط ثابت کر دیا۔ وہ ادب کے میدان میں

”شکرے“ اور ”پٹرل“ کے گیت گاتا ہوا داخل ہوا۔ اُس نے اپنے نغموں میں جاں فردشوں کا دیوانہ پن سنایا اور

طوفان کو بلاوا بھیجا تاکہ ”ایک کاری ضرب لگائی جاسکے!“

چنانچہ ۱۹۲۵ء کے انقلاب میں گورکی کے ادب کی کارفرمائی بڑی حد تک شامل تھی۔ اُس انقلاب و طوفان

کے آنے میں گورکی جذباتی گیت اور ”واقعیاتی“ ناولوں (*Three, Fromagorveyew*) کے اثر کا

کافی مات تھا۔ گورکی نے قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ عین انقلاب کی حالت میں بھی اعلیٰ صنعت رونما ہو سکتی ہے۔

بہت سے مختلف مضامین کے علاوہ جو دنیا بھر کے اس قسم کے ادب میں اعلیٰ مرتبہ کی تحریریں ہیں، گورکی نے

ایام انقلاب میں صنعت ادب کے دو شاہکار پیدا کئے: یعنی (*Automatov Buro*) اور

(*Knife of Kleinsangin*)

۱۹۱۶ء میں زار کی ”مطلقیت“ فنا کی جا چکی تو سوشل ریولوشنری (*Menshevik*) ذہین

طبقے نے طاقت حاصل کر کے روس کا لیڈر بننا چاہا تھا۔ ان دونوں میں گورکی نے انھیں خود پرست اور دغا باز

جماعتوں کے مرقعے پیش کئے ہیں، اور دکھایا ہے کہ یہ جماعتیں کس طرح ابھریں اور کیونکر ڈوب گئیں۔

فنون لطیفہ اور تذکرہ نگاری کے باب میں جتنا کچھ بھی کہا گیا ہے (خاص کر اٹھارویں صدی میں) وہ سب کچھ ان دونوں پر صادق آتا ہے۔ یعنی اگر ان دو کتابوں کو پڑھ لیا جائے تو قبل اکتوبر روس کی حالت آئینہ ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ملک کے کارخانوں کے "لبرل" مالک اور منشیو دیک "نجات دہندہ" کو اسی قبر کے اندر کیوں سونا تھا جس میں "زاریت" سو رہی تھی!

"ارٹمانوف بزنس" میں گورکی نے ایک بورژوا مالک فیکٹری کی تاریخ لکھی ہے جو ۱۸۶۱ء سے شروع ہوتی ہے جب "سرفیت" یعنی موروثی زراعتی غلامی ختم ہونے کے بعد بورژوا طبقے نے فیکٹری کے مالک کی حیثیت سے جاگیردارانہ آقا کی جگہ اختیار کر لی تھی اور جو ۱۸۹۱ء میں اس وقت ختم ہوئی جب "شاہی" کی سیاسی طاقت اور اشراف و بورژوا کے اقتدار کو فنا کر کے عوام کی "پروٹاریا حکومت" قائم ہو گئی۔ اس تاریخی پیمانہ کو گورکی نے صناعتی مرقع بنا کر پیش کیا ہے۔

اس ناول میں ایک جاگیردار ریاست کا ایک مالک ۱۸۶۱ء کی آزادی کے بعد پرانے شہر ڈرمیون کے لوگوں کو مخاطب کر کے یہ کہتا ہے۔

"اشراف کے اقتدار کا دور ختم ہو گیا، اب تم خود اشراف ہو۔ اب یہ وقت ہے کہ ہر شخص اپنی قابلیت ظاہر کرے کہ وہ کیا کر سکتا ہے!"

یہ الفاظ ہیں الیا ارٹمانوف کے جو اس ناول کا ہیرو ہے۔ آگے چل کر یہ اشراف کی قوتوں کو اس طرح ابھارتا ہے "سرفیت ختم ہو گئی کیونکہ وہ حرفتی کارخانوں کی گردن پر بھاری جوا ثابت ہو رہی تھی۔ اشرافیت *Not a business* فنا ہو گئی کیونکہ وہ کسان کی پیداوار کو بیجا طریقوں سے خرچ کرنا تو جانتی تھی مگر اس فن سے واقف نہ تھی کہ "رضامند مزدور" سے فائدہ کیونکر حاصل کیا جاسکتا ہے! اشراف طبقہ اس مشکل کو جو ایک تاریخی نتیجہ تھی حل نہ کر سکتا تھا!"

الیا ارٹمانوف ایک فیکٹری جاری کرتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ یہ کارخانہ صدیوں تک چلتا رہے گا وہ اپنی اولاد سے کہتا ہے:-

"اب تین سو سال تک تمہارے بیٹوں پوتوں کے لئے کام کی کمی نہ ہوگی۔ ارٹمانوف کی نسل

دنیا میں بڑھے پھیلے گی!"

ارٹمانوف ایک نئی تاریخ شروع کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک دیر پا کتاب ہوگی۔ عوام کو غلام بنائے رکھنے کے مقصد کے لئے ارٹمانوف ایک اور نسخہ استعمال کرتا ہے:-

"صبر سے دیکھتے جاؤ، سب چیزیں ہماری اپنی ہوں گی۔ ہم ایک گرجا بنوائیں گے، ہمارا قبرستان بھی الگ ہوگا

اسکول بھی خاص اپنا ہوگا، اور اسپتال بھی!"

ارٹمانوف خوب جانتا ہے کہ عوام کو پھنسا کر رکھنے اور احمق بنانے کے لئے یہ پھندے نہایت کارگر ہیں۔ کارخانے کے مزدور انھیں ”فیاضیوں“ کی بدولت اپنے ”نیکدل مالک“ کو یاد رکھتے ہیں! اپنا یہ پروگرام پورا کرنے کے لئے الیا ارٹمانوف تو زندہ نہیں رہتا، وہ ایک حادثے میں مر جاتا ہے، لیکن وہ حرفتی سرمایہ داری کی بنیاد قائم کر جاتا ہے۔

گورکی کی یہ مخلوق، جاگیردارانہ روس پر حرفتی سرمایہ داری کی فتحی کا ایک نشان ہے اور روس ہیرڈی اری کی ترقی اور اس کی عیاری و مکاری کا مجسمہ بھی! الیا ارٹمانوف اگرچہ ”ارٹمانوف ہرنس“ کی عمارت کا سیمنٹ ہے لیکن اس کے اندر وہ تمام تخالف موجود ہے جو اس ”ہرنس“ کا دیوالہ نکال دینے والا ہے۔ مگر یہ تناقض اس کے زمانے میں نہیں بلکہ اس کی دوسری پشت میں رونما ہوا اور اُس کے کاروبار کی تباہی اس کے بیٹے اور پوتے کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

ارٹمانوف کی دو پشتوں کی تاریخ بیان کر کے گورکی نے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ روسی سرمایہ داری بالآخر ”شان و مباہات“ ہونے کے بدلے ”قید خانہ“ ثابت ہوئی۔

گورکی نے ناول کا خاتمہ بوڑھے چوکیدار تھان کی گفتگو پر کیا۔ تھان ارٹمانوف اور اس کے بڑے بیٹے پیٹر کی نوکری کر چکا تھا۔ تھان کی یہ گفتگو بوڑھے پیٹر سے اکتوبر کے بعد ہوتی ہے۔ انقلاب اکتوبر کے وقت ارٹمانوف کا پوتا کاروبار چلا رہا تھا اور انقلاب کے وقت بوڑھے باپ پیٹر کو اس کی قسمت کے حوالے کر کے خراب ہو گیا۔ اس وقت پیٹر کے سوال کے جواب یہ ہیں:-

”کیا دشمن یہاں بھی آگئے۔۔۔۔۔ فیکٹری کے اندر یہ فوجی سپاہی کیا کر رہے ہیں؟“

بوڑھا چوکیدار جواب دیتا ہے کہ:-

”پیٹر ایاخ، یہ جنگ تمہارے ہی خلاف تو ہے! اور یہ جنگ آخری بھی ہے! اب شاید دوسری لڑائی کی نوبت نہ آئے گی!“

گورکی نے بوڑھے تھان کے منہ سے یہ الفاظ کہلا کر اس تمام نفرت کا اظہار کر دیا ہے جو غلاموں کو مویشیوں کی طرح ہانکنے والوں کے خلاف پسپا جماعت کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ بوڑھا ترخان کہتا ہے:-

”میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اب غلامی اور جفاکشی کوڑس کرکٹ کی طرح صاف کر دی جائے گی! میں دیکھ دیکھ حیران رہتا تھا

کہ آخر یہ ظلم کب تک جاری رہے گا! آخر وہ دن آگیا۔۔۔ تم اسی کے سزاوار تھے!“

گورکی کا یہ ناول روس کے حرفتی بوڑھوں و طبقے کی خوشحالی اور پھر اس کی بربادی کا ایک مرکب و منظم مرقع ہے الیا ارٹمانوف طبقے کی طاقت یا عمر بس اتنی تھی کہ اپنے تاریخی دور میں تھوڑی دور چل لے! الیا ارٹمانوف کے

بیٹے پوتے کمزور تھے۔ وہ خدا سے ڈرتے تھے کیونکہ ان کے طبقے کا نظام ”مذہبی سیاسی“ اہمیت بھی حاصل کر سکا تھا۔ ان کی مالی و مادی طاقت کے باوجود اس طبقے کے کلچر کی زمین بخر تھی۔ وہ سیاست و تدبیر میں دیوالیہ تھا اور خود اپنی زندگی کو منظم کر لینے میں نااہل! اس طبقے کے سب سے بہتر کلچر کے لوگوں میں یا تو موٹے اور غبی پادری تھے یا اپنی دانتہ عورتوں کے عاشق فوجی افسر۔

آخری ارٹمانوف جسے اکتوبر کے واقعہ نے بدحواس کر دیا، اگر اپنے دادا کی سی ہمت کا آدمی ہوتا تو وہ الیا ارٹمانوف کے انھیں الفاظ کو دوسرا تاکہ:-

”حرفتی کارخانہ داروں کے خاتمہ کا وقت آگیا“

انقلاب اکتوبر کے بعد کا اپنی دوسری اہم تصنیف میں گورکی نے اس حقیقت واقعہ کا اظہار کیا ہے کہ شاہی کا خاتمہ ہونے کے بعد تعلیم یافتہ روسی بورژوا، لبرل ذہن طبقہ، اور دوسرے لوگ جو اشتراکی ترقی کے کاموں کو چلانے پر آمادہ ہو گئے تھے، اس کام کی انجام دہی کے لئے کس درجہ نااہل تھے۔

(Klim Samgin) اسی صدی کے آخر ربع میں، ایک ذہین آزاد خیال بورژوا خاندان میں پیدا ہوا۔ اپنے بچپن کی جو بات اُسے یاد ہے وہ (Narodovltse) پارٹی کی جانفروشاہ تباہی کا واقعہ ہے۔ طالب علمی کے زمانے کے دو واقعے اس کے ذہن میں محفوظ ہیں ایک مزدوروں کی عام تحریک کی ابتداء ہونے کا اور دوسرا یہ کہ نکولس ثانی، رومانوف خانوادے کا آخری بادشاہ کی تخت نشینی پر ماسکو کے خادین میدان میں ہزاروں انسان موت کے گھاٹ اُتار دئے گئے تھے۔

اس وقت تک (۱۹۰۵ء) اس کتاب کے تین حصے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں کلم ساگن کی زندگی کی داستان درج ہے، دوسرے لفظوں میں ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے وقت اور اس کے بعد کے ”رجعتی“ عہد میں روسی لبرل بورژوا اور ذہین طبقے کی حالت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مرتبے میں ماسکو، پیٹرسبرگ، روسی دیہات، ۹ جنوری، ماسکو کا انقلاب اور اس کی ناکامی، رجعتی قوتوں کی فتمندی، اور ذہین طبقے کی انقلاب کے ساتھ ”عشق بازی“ یہ تمام پہلوئیکے بعد دیکھے، اس ناول میں سامنے آجاتے ہیں۔

الحاصل، گورکی نے ان دونوں ناولوں میں قبل انقلاب کے روس کی اُس تصویر کو مکمل کر دیا ہے جو اُس نے شروع میں اپنے استاد انشاؤں سے (Formagordev, Oknow Town) اور (Life of Kozhemyakun) کے اندر دکھائی تھی۔

ان تمام تصانیف میں اکتوبر سے پہلے کا ”ملکیت“ والا بورژوا روس اپنے اصلی روپ میں نظر آجاتا ہے ”اوکوف ٹاؤن“ قصباتی روس کی تنگ خیالی کی تصویر ہے۔ ”فورماگورڈیف“ کے کردار میاکنس اور

ارٹمانوٹ خاندان روس کے صنعتی سوداگروں کی وحشیانہ بیرحمی اور ان کے کمزورہ لالچ کا مرقعہ ہی کلمہ ساگن
ذہین طبقے کے اندر قوت ارادی کے فقدان اور اخلاقی دیوانہ کا ہو بہو نقشہ ہے، اور بتاتا ہے کہ خود غرضی
اور خوف کی "پریر" انتہا پسندی کی نقالی کر کے (مصمص) اسپرٹ اور ارٹمانوٹ مفاد کی کیونکر
حفاظت کی جا رہی تھی۔

"ملکیت" واسے روس کو سمجھنے کی گہری صناعتانہ باریک بینی جو گور کی کی خاص خصوصیت ہے، وہ اسکی
ابتدائی تصانیف یعنی "فورماگور ڈیٹ" اور "تھری" سے لیکر آخر زمانہ کی یادگار تصانیف یعنی "ارٹمانوٹ
بزنس" اور "کلم ساگن" کے اندر برابر ظاہر ہوتی رہی ہے، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی کی ہوسناکی
اصل میں "شخصی ملکیت" اور اس کے نظام کا نتیجہ ہے۔

چالیس سال کی مسلسل مصروفیت میں گور کی نے جس قدر تخلیقی کام کیا ہے وہ بلزاک کی Human
Comedy اور زولا کی (Rogan Macqura) سے کم نہیں۔ بلزاک جاگیر کے انہدام سے لیکر
شاہی خاتمے تک فرانس کو پیش کر دیتا ہے، اور زولا نے دوسری شہنشاہی عہد میں ایک خاندان کی فطری اور
سماجی تاریخ پیش کی ہے، گور کی "سرقت" کے اندر اسے انقلاب سلسلہ تک کا مرقعہ اور اشتراکی تعمیر
کے کچھ باب بھی پیش کرتا ہے۔

بلزاک اور زولا کی صنعت اصل میں اسوقت کے فرانس کی بورژوا زندگی کے مرقعے ہیں مگر گور کی کی تصانیف
میں ۱۸۶۱ء سے لیکر ۱۹۱۷ء کے پروتاریا انقلاب کے روس کا پورا خاکہ نظر آ جاتا ہے۔
بلزاک اور زولا اپنی ادب سے بورژوا کے پھٹے لباس میں پیوند لگاتے ہیں، سرمایہ داری کا سدھار
کرنے کے طریقے ڈھونڈتے ہیں، اور گور کی اپنی صنعت کے اندر دکھاتا ہے کہ سرمایہ داری کو مٹا کر ایک
نیا اشتراکی نظام قائم کرنے ہی سے بیمار انسانیت صحت پاسکتی ہے۔

ل۔ احمد

تاریخ اسلامی ہند مع توفیت

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۳۴۲ صفحات پر - قیمت مع محصول ۱۲/۱۱
پنجر نگار لکھنؤ

چار درویش

یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو دہلی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ اس لئے بہت مختصر تھی۔ انھوں نے یہ اعتراض کیا کہ: اگلی معیار و مقصد سے دور جا پڑی ہے۔ ان کی فرمائش ہوئی کہ اسے ان کی گول کی چیز بنادوں۔ میں نے کہا: یہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اسے واپس منگا لیا گیا۔ نظر ثانی میں یہ طویل بھی ہو گئی اور جا بجا ایسی باتیں بھی آگئیں جو آل انڈیا ریڈیو کو کبھی گوارا نہیں ہو سکتیں اور نہ ہونی چاہئیں۔

رشید احمد صدیقی

آج سہ پہر کی گاڑی سے چار درویش ریل سے اترے۔ دلی کے اسٹیشن پر اس قسم اور اس برزخ کے لوگ اور کبھی نہیں دیکھے گئے تھے۔ ہر طرف چہ میگوئیاں ہونی لگیں۔ چنانچہ والے چلتے چلتے رک گئے۔ قلیوں نے جھگڑنا، بابوؤں نے غلط انگریزی اور صاحبوں نے غلط اردو بولنا ترک کیا۔ مسافر ایک دوسرے کا منہ اور ہم آپ ایک دوسرے کی جیب تکنے لگے۔ اتنے میں ایک درویش کے چھینک آئی۔ معاً یہ خبر اڑی کہ دشمن نے کچھ آدمی ہوائی چھتریوں سے اتار دئے ہیں۔ چنانچہ جس سے جو بن پڑا اس نے کیا۔ کوئی بے بھاگا، کچھ بھگائے گئے اور بقیہ نکل بھاگے۔ ایک گالی بکنے لگا، دوسرے نے دعائیں مانگنی شروع کی۔ کسی نے اقبال کے ترانہ سے شروع کیا اور بندے ماترم پر ختم کیا۔ کچھ عورتیں بے ہوش ہو گئیں، کچھ کو بے ہوش ہونے نہیں دیا گیا۔ بقیہ کا فوٹو لے لیا گیا، کچھ بچے چوری گئے، کچھ سادھو پیٹ گئے۔ دس پانچ بے ٹکٹ نکل گئے، لیڈروں نے بیانات شائع کر دئے۔ ”یوم سبکداری“ کا اعلان کیا۔ چنانچہ ”ہر برقی“ یا ”تیر بہدف علاج“ کے نیچے اوپر، دلی کی گلی کوچوں میں ”یوم سبکداری“ کا اشتہار نظر آنے لگا چاروں درویش حراست میں لے لئے گئے اور دلی کے بڑے خواجہ صاحب کو ٹیلیفون کر دیا گیا۔

پولیس والوں نے درویشوں کو ادھر ادھر سے خوب ٹٹولا اور ٹٹونکا بجا یا تو معلوم ہوا کہ ان میں کوئی بھیس بے ہوئے نہ تھا اور نہ دشمنوں سے ان کا کوئی تعلق تھا بلکہ ہر ایک عین عین چار درویش ہی قسم کی چیز تھا۔ گفتگو میں بھی تعزیرات ہند نہیں بلکہ ریڈیو قسم کی باتیں دریافت ہوئیں۔ چنانچہ پولیس والوں نے جان لینے کے بجائے جان چھڑانے کی فکر شروع کی۔ شدہ شدہ یہ خبر ریڈیو والوں کو پہونچی جنھوں نے دوڑ دھوپ کر درویشوں کو اپنے

قبضہ میں کیا — اور سب کا پروگرام بنا ڈالا !

بھولتا بھٹکتا میں بھی ریڈیو اسٹیشن پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چاروں درویش پاؤں اٹھائے، عبا سمیٹے صوفے پر بیٹھے ہیں۔ ہر طرف آرٹسٹ جمع ہیں یعنی ہر عمر ہر جنس ہر فن ہر پیشہ، ہر حلیہ اور ہر مہر و کھنکھ کے لوگ۔ درویشوں میں سے کسی کے گلے میں تسبیح، کسی کے ہاتھ میں پشت خار، کوئی کفنی گلے میں ڈالے اور کسی کی ٹوپی۔ کلاہ گوشہ دھنقاں بہ آفتاب رسید !

میں کسی قدر دیر سے پہنچا تھا اس لئے نہیں بتا سکتا کہ اس سے پہلے کیا اور کس قسم کی گفتگو ہوئی، البتہ جہاں سے میں نے سنی وہیں سے آپ کو سناتا ہوں۔

پہلا درویش :- آپ نے ہمارے متعلق جو کچھ فرمایا وہ آپ کا حسن اخلاق ہے۔ خدا جزائے خیر دے لیکن ہم میں کیا رکھا ہے کہ ہم کچھ سنائیں اور آپ سنیں۔ ہماری باتیں تو کتابی ہوئیں وہ بھی ایسی کتاب کی جسے جہاں تہاں سے کیرٹوں نے چاٹ کر رکھ دیا ہو۔

دوسرا درویش :- یا ایسی کتاب جس کے اول اور آخر کے اوراق غائب ہو چکے ہوں۔

ایک صاحب :- ”گل یوم ہونی شان“ بھی تو کوئی چیز ہے۔

پہلا درویش :- ”گل من علیہا فان“ اپنی جگہ پر اٹل ہے۔

ایک آرٹسٹ :- لیکن پیر و مرشد ہمارے مشکل یہ ہے کہ ہم سب گل یوم ہونی شان اور گل من علیہا فان دونوں کی زد میں واقع ہیں۔

تیسرا درویش :- زد میں نہیں واقع ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کہیں نہیں واقع ہیں۔

دوسرا آرٹسٹ :- گستاخی معاف ہم تو ضرور واقع ہیں، کوئی اور واقعہ ہو یا نہیں۔

ایک بے فکر :- آپ واقعہ نہیں ہیں، حادثہ ہیں۔

دوسرا بے فکر :- قابل دست اندازی پولیس !

(تہقیر)

چوتھا درویش :- دریا بوجہ غولیش موجے دارو

خس پندار دکہ ایس کشاکش با اوست

آرٹسٹ :- لیکن جناب والا، ہمارے سامنے دریا کے دھارے کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی اہمیت

بہنے اُبھرنے اور ڈوبنے کی ہے۔

(ایک آواز :- ڈوبنے والے کی بھی !)

تیسرا درویش :- زمان و مکان کی اہمیت سے بھی تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔

آرٹسٹ :- اہمیت سے انکار نہیں ہے لیکن اُن افراد یا واقعات کو بھی تو نظر انداز نہیں کر سکتے جو زمان و

مکان سے بے نیاز ہو کر یا اُس سے ماورا بہتے ہیں۔
چوتھا درویش :- زمان و مکان سے بے نیاز یا ماورا ہونا تصور کی رفعت یا عقیدہ کی سختگی سے تو مانا جاسکتا ہے لیکن اسے ثابت نہیں کر سکتے۔

ایک خاتون :- مان لیتے ہیں لیکن ثابت ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ کیا خوب !
ایک بے فکر :- تعجب ہے، اقرار و انکار کے رمز سے آپ ناواقف ہوں !
دوسرا درویش :- زمان و مکان سے ماورا صرف ابدیت ہے۔
ایک صاحب :- زمان و مکان کا رشتہ ابدیت سے کیا ہے ؟
دوسرے بزرگ :- بھائی خدا کے لئے اس رشتہ کو جہاں کا تھاں رہنے دیجئے ورنہ میرے نکسیر کھوٹا چاہتی ہے۔

(تہقہہ)
ایک قلندر :- (گاتا ہے) کچھ نہ زمان و مکاں کچھ نہ سپید و سیاہ
اشہدان لا الہ، اشہدان لا الہ
(مجمع پر سکوت)

ایک صاحب :- گزشتہ زمانہ کے مقابلہ میں آج کل زندگی میں جو قلب ماہیت نظر آتی ہے اُسے آپ کیا بتائیں گے
ایک درویش :- قلب ماہیت تو کوئی چیز نہیں ہے۔
وہی صاحب :- کیسے ؟ سائنس کی رو سے ایک چیز دوسری چیز میں تبدیل یا تحویل ہو جاتی ہے۔ آدمی قوت میں، قوت روشنی میں، روشنی آواز میں۔

بے فکر :- آواز ریڈیو میں !

درویش :- صرف قوت چولا بدل لیتی ہے۔ ماہیت نہیں بدلا کرتی !
دوسرا درویش :- اس غلط فہمی سے بچنے کے لئے ہم قوت کی بجائے قدرت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔
تیسرا درویش :- حضرات الفاظ پر نہ جانیے۔ یہ تحویل و تبدیل اور اس قسم کے دوسرے نام تو آپ کے دئے ہوئے ہیں۔ آپ کے سمجھنے یا سمجھانے کے سہارے یا واقعات۔ نفس حقیقت اپنی جگہ پر ہے۔
بے فکر :- تو جناب یہ بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ نفس حقیقت کے ساتھ ساتھ ہم آپ بھی اس ساری بحث میں اب تک وہیں ہیں جہاں پہلے تھے۔
(تہقہہ)

ایک صاحب :- لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس نے ہماری زندگی کے تصورات بدل لئے ہیں بہت سے ایسی باتیں جو کبھی مسلمات میں تھیں اب تو ہمت میں شمار ہوتی ہیں۔
ایک درویش :- زندگی کے تصورات بدلتے ہی رہتے ہیں۔ سائنس سے پہلے بھی اس قسم کے واقعات ہوئے ہیں

توہمات اور مسلمات میں نوع کا فرق نہیں ہے درجہ کا اختلاف ہے۔ توہمات ہی کا تتمہ مسلمات ہیں اور یہی مسلمات عمر طبعی پر پہنچ کر توہمات کی طرف عود کر جاتے ہیں۔

ایک صاحب :- (اکتا کر) تو خدا را یہ بتائیے کہ حقیقت کیا ہے۔
درویش :- یہ دریافت کب ہوئی ہے کہ بتائی جائے۔

وہی صاحب :- پھر ؟
درویش :- اس عالم میں تو حقیقت کی طلب و تلاش ہی حقیقت ہے۔

بے فکر :- مثلاً بے روزگاری !
ایک صاحب :- لیکن سائنس کے انکشافات و برکات سے تو آپ کو انکار نہیں۔ زندگی کی کتنی گتھیاں سلجھ گئیں۔
ایک آواز :- اور ابھی بھی کچھ کم نہیں ! اور کتنی نعمتیں میری آئیں۔ ان کا اندازہ تو آپ کر ہی سکتے ہیں۔
درویش :- انکشافات و برکات میں فرق ہے۔ سائنس کے انکشافات اور سائنس کی برکات کا حال تو یورپ ہی سے پوچھئے۔

ایک شخص :- کہنے کو جو چاہے کہ لیجئے لیکن زندگی کو جس قدر پرہم سمجھنے اور برتنے لگے ہیں اس سے قدیم زمانہ کے لوگ یقیناً بے خبر اور محروم تھے۔

درویش :- ممکن ہے ہم بے خبر رہے ہوں۔ اس کا ہمیں انسوس بھی ہو سکتا ہے لیکن اس سے محروم ہونے نہ ہونے کا سوال بالکل علیحدہ ہے محروم تو وہ ہے جس کو کوئی نعمت نہ ملی ہو یا اس کی نعمت چھین لی گئی ہو۔ آپ نئی ضرورتیں پیدا کر کے انھیں پورا کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ آپ نے ایک نعمت ملگئی اور آپ نے بڑا کام کیا۔ ہم ضرورتیں پیدا کرنے کے عادی نہ تھے اس لئے ان کے پورا کرنے نہ کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

ایک صاحب :- ضروریات کا پیدا ہوتے رہنا اور ان کے پورا کرنے میں کامیابی حاصل کرنا انسانی کارکردگی اور ترقی کی بہت بڑی نشانی ہے۔

دوسرے بزرگ :- وقتیں پیدا کر کے ان پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کرنا مجھے تو فصل عبث معلوم ہوتا ہے۔
درویش :- نہیں، انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔ ضروریات کا پیدا ہوتے رہنا اور وقتیں پیدا کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ ضروریات کا پیدا ہوتے رہنا اچھی بات ہے لیکن ہر ضرورت کا خواہ مخواہ پورا کیا جانا معقول بات نہیں ہے۔ اس سے انسانی ضروریات کا غلام بن کر بالآخر ان کا شکار ہو جاتا ہے۔ ضروریات کا پیدا کرنا بھی اچھا نہیں ہے۔ یہ حرکت تاجروں یا لیڈروں سے سرزد

ہوتی ہے جو بالعموم خود عرضی کے بندے ہوتے ہیں۔

ایک صاحب :- تو پھر اس مسئلہ کا حل کیا ہے۔

درویش :- یہ ضرورت ایجاد کرنی چاہئے اور نہ اُس کے پورا کرنے کی جنون میں مبتلا ہونا چاہئے۔ دونوں پر احتساب!

ایک بے فکر :- مثلاً بلوہ میں کوئی ہرج نہیں بشرطیکہ بلوائی اور پولیس دونوں سزا پاتے رہیں! (تہقیر)

درویش :- زندگی کا احتساب ہی زندگی میں تازگی، توانائی اور توازن پیدا کرتا رہتا ہے زندگی کے کھوٹے

کھرے کی پہچان ہی تو سب کچھ ہے۔ لیکن موجودہ عہد میں آپ زندگی کے ہر مسئلہ کا حل بالعموم

صرف دو طریقوں سے کرتے ہیں، سائنس سے یا ووٹ سے۔ زندگی کی کتنی انھیں دوناخوں سے

سلجھائی جا رہی ہے۔ حالانکہ سائنس صرف طاقت اور قانون کا سراغ لگاتی ہے اور ووٹ

سے، ووٹ حاصل کرنے والے کے روئے، رعب یا عیاری کا پتہ چلتا ہے نہ کہ ووٹ دینے والوں

کی تمیز و ایمانداری کا۔ یہ دونوں مسائل اخلاق و انسانیت سے ماورا ہیں۔ اخلاق و انسانیت

کا سرچشمہ تو کہیں اور ہے۔

ایک آرٹسٹ :- لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر ہم نے زندگی کے مسائل حل کر لینے میں کامیابی حاصل نہیں کی

تو اُس سے پورے طور پر لذت یا ب ہونے میں تو یقیناً کامیاب ہوئے ہیں۔

درویش :- زندگی اتنی مختصر اور سہل چیز نہیں ہے جس سے لذت یا ب ہونے نہ ہونے کا مسئلہ آپ نے کہہ دیا

اور وہ طے ہو گیا۔ آپ بتائیے تو زندگی کیا ہے اور لذت یا ب ہونا نہ ہونا کیا ہے؟

ایک شخص :- ان فلسفیانہ بحثوں کا کوئی نتیجہ نہیں۔

درویش :- اگر فلسفیانہ بحثوں کا کوئی نتیجہ نہیں تو سائنس کے کارناموں پر سر دھننا بھی حق بجانب نہیں۔

ایک صاحب :- حضرات کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم ایک ایک مسئلہ سامنے رکھ کر تبادلہ خیالات کرتے چلیں۔ سمندر میں

ستوسانے سے کیا فائدہ۔

بے فکر :- فائدہ تو درکنار، آج کل تو سمندر میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔

ریڈیو کا افسر :- خبردار، جو اس طرح کی باتیں زبان سے نکالیں۔

ایک قلندر :- تمام خطرات بحق رائٹر و ایسوسی ایٹڈ پریس محفوظ ہیں!

بے فکر :- خطرات یا سمندر؟

افسر :- ایک دو تین، نکل جاؤ یہاں سے۔ بس ایک دم۔

بے فکر :- کان پکڑتا ہوں، حضرت گورے صاحب قبلہ۔ (تہقیر)

وہی۔ احب۔ جناب من، کچھ اور نہیں تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کے عہد میں قانون کا وہ مفہوم نہ تھا جو اب ہے۔ مثلاً آپ کے زمانہ میں چوری کرنے میں بھی سر قلم کر دیا جاتا تھا اور کسی کو مار ڈالنے پر بھی یہی سزا دی جاتی تھی اس اختلال توازن سے سوسائٹی میں جیسی کچھ ابتری ہو سکتی تھی ظاہر ہے اب یہ تو اطمینان ہے کہ جرم اور سزا میں مناسبت رکھی جائے گی۔

درویش :- میں تو اگلے وقتوں کا ہوں جب نہ سوسائٹی کا لفظ رائج تھا اور نہ اختلال توازن کا کوئی تصور تھا۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ آج کل جب سوسائٹی اور قانون اور سائنس اور آرٹ اور جمہوریت یا جبریت کا دور دورہ ہے کسی کا مال چُرا لیجئے تو قید کی سزا دی جاتی اور کسی کی بیوی چُرا لیجئے تو کچھ بھی نہیں! (تہقہہ)

ایک صاحب :- (نہایت سنجیدہ صورت بنا کر) لیکن جناب دارا اس میں تو کوئی شک نہیں کہ عورتوں کو صدیوں کی غلامی سے آزاد کرانے میں عہد جدید کا بہت بڑا حصہ ہے اور آپ نہیں تو عورتیں تو اس کی داد ضرور ہی دیں گی۔

ایک بے فکر :- (خاص انداز سے گا کر) داد بھی ملتی رہے ہوتی رہے فریاد بھی! (تہقہہ)

درویش :- جب آپ عورتوں ہی کی داد لینا چاہتے ہیں تو ہم جیسے دقیانوسیوں کو کیوں منہ لگاتے ہیں۔ بے فکر :- عورتیں دقیانوسیوں کو بھی منہ لگانے پر داد دے سکتی ہیں!

(تہقہہ - لیکن عورتوں میں برہمی)

عورتیں ہم زبان ہو کر۔ اس سخرہ کو فوراً نکالو، خواتین کی موجودگی میں اس طرح کی برہمنی ناقابل برداشت ہے، اس کا تدارک کیا جائے ورنہ ہم فوراً جلوس نکالیں گے وغیرہ)

(بے فکر معافی مانگتا ہے اور عورتوں کے حلقہ سے نعرہ تحسین بلند ہوتا ہے)

درویش :- اگلے زمانہ میں عورتوں کی جیسی کچھ حالت رہی ہو اس سے قطع نظر اپنے عہد کا جائزہ لیجئے۔ عورتوں کی زیبائش و آرائش اور ان کی ہر طرح کی آزادی آپ کے نزدیک انکے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔ ممکن ہے ہو۔ میرے نزدیک تو پہلے اگر وہ قیدی تھیں تو اب کھلونا ہیں دونوں حالتوں میں آپ ہی کے ظلم یا خود غرضیوں کا شکار رہیں۔ عورت اور مرد کے توازن کو سمجھنا اور قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ جو بات مرد و عورت کے لئے علیحدہ علیحدہ موزوں یا مستحسن ہے وہی شوہر اور بیوی کے تعلق کو صحیح اور متوازن رکھنے میں مضرت ثابت ہو سکتی ہے۔ بحیثیت شخص کے عورت یا مرد ایک سطح پر رکھ دئے جاسکتے ہیں لیکن جنسی یا زنا شوقی

تعلقات کے اعتبار سے یا ان عینسی تعلقات سے جتنے اور شاخسانے پھوٹتے ہیں ان کی رو سے ان کا یکساں سطح پر ہونا دونوں کے لئے غیر مفید ہو سکتا ہے باوجود اپنے تمام بلند بانگ ادعا کے آپ نے عورت کو وہ درجہ نہیں دیا ہے جو اُسے ملنا چاہئے۔ آپ نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا ہے کہ اُسے وہ سطح دیدی ہے جس کا وہ سوچ کر نہیں بلکہ گہرا کر مطالعہ کرنے لگی ہے۔

ایک صاحب :- (گہرا کر) عورت کا قضیہ چھوڑئے۔ موجودہ عہد کی سوسائٹی کا اندازہ کیجئے۔ اس میں اور آپ کے عہد کے طور طریقوں میں کتنا فرق ہے۔

ایک درویش :- آپ ہی بتائیے وہ کیا فرق ہے ؟

وہی صاحب :- پہلے انسان اوہام میں مبتلا تھا۔ اُسے اپنی عظمت کا احساس نہ تھا۔ وہ توہمات میں پھنس کر انسانیت کے مقاصد اور زندگی کے لطائف سے بے خبر بھی تھا اور محروم بھی۔ اعلیٰ طبقہ نے اُسے طبقت کو خوف غلامی اور بالہوسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب علم عام ہے انسانیت کے مطالبات واضح ہیں۔ زندگی کی راحتیں اور دلچسپیاں عام ہیں۔ ہر شخص سوسائٹی کا آزاد رکن ہے اور اعمال و افکار کے اعتبار سے مختار قرار دیا گیا ہے۔

درویش :- آپ نے ٹھیک فرمایا، آپ کے اور میرے زمانہ میں فرق ضرور ہے لیکن اصلاً یہ فرق ترقی و تنزل

یا خوبی و خرابی کا نہیں ہے۔ فرق صرف سمجھنے اور سمجھانے کا ہے۔ انسان کب اوہام میں مبتلا نہیں رہا۔ توہمات ہیں اسیر ہو جانے سے ہم آپ زندگی کے لطائف سے کیونکر محروم ہو گئے۔ لطائف کا سرچشمہ ہی توہمات ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے آپ دنیا کی مختلف اقوام کے تصورات یا توہمات کا اندازہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان کے تصورات آپ کے معیار سے مختلف ضرور ہیں لیکن اپنے معیار سے وہ اپنے آپ کو آپ سے زیادہ خوش قسمت یا حق بجانب سمجھتے ہیں۔ پھر میرے نزدیک آپ کا یہ کہنا بھی قرین صواب نہیں ہے کہ آپ کے موجودہ نظام اجتماعی میں ہر شخص اپنے اعمال و افکار کے اعتبار سے مختار ہے۔ انسانی ذہن و دماغ پر ہمیشہ پابندیاں نافذ رہیں۔ اکثر وہ مقید ہی رہا ہے۔ کبھی کم کبھی زیادہ۔ پہلے مذہب و اخلاق مسلط تھا، اب جمہوریت یا جباریت ہیں۔

پہلے صحیفہ الہی تھا، اب صحیفہ کاغذی ہے۔ آپ انسانی فکر و عمل کی آزادی کا غلط تصور رکھتے ہیں انسانی فکر و عمل اپنی خاصیت و جبلت کے اعتبار سے مقید ہیں آزاد نہیں۔ یہ بہت سے امور سے گراں بار ہیں جو اکثر فکر و عمل کی نوعیت تک بدل دیتے ہیں۔ افراد بحیثیت افراد کے ممکن ہے ذہنی اعتبار سے آزاد ہوں گو مجھے اس میں بھی کلام ہے لیکن جہاں افراد کی تعداد بڑھی زنجیر آموجود

ہوئی۔ انسان زیادہ سے زیادہ یہ کرتا ہے کہ زنجیر کے جن حلقوں میں وہ جکڑ دیا جاتا ہے انھیں حلقوں کو تڑپ تڑپ کر ذرا زیادہ وسیع کر لیتا ہے۔ اور خوش ہوتا ہے کہ اُس نے رہائی پالی!! ایک شخص :- یہ کیوں کہنے کہ انسانی جماعت زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ کیوں نہ مان لیا جائے کہ انسانی جماعت ایک شیرازہ میں منسلک ہے!

درویش :- اگر آپ اس تصور سے خوش ہوتے ہیں تو یونہی سہی۔ ”جادوئے محمود کی تاثیر سے“ ”چشم ایاز“ ”حلقہ گردن میں سازِ دلبری“ دیکھئے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن شیرازہ اور زنجیر دو استعارے نہیں ہیں بلکہ دو حقیقتیں ہیں۔ دو مقاصد ہیں جن سے دو مختلف بلکہ متضاد ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ اس وقت دنیا زنجیر بند ہے شیرازہ بند نہیں۔ آپ ہی بتائیے کیا ایسا نہیں ہے؟ ایک شخص :- (اُکتا کر) بھئی، یہ باتیں تو ایسی ہیں جو کبھی طے نہ پائیں گی اور طے بھی پا جائیں تو ہم آپ نہ مانیں گے اور نہ مانیں گے تو کوئی ہمارا کیا کر لے گا۔ اب کچھ ایسی باتیں ہونی چاہئیں جو سننے والوں کے چلے پڑیں۔ یہ کیا فکر و عمل و لٹھ بند اور خدا جانے کیا کیا۔

دوسرا شخص :- اور کیوں پیر و مرشد یہ فکر و عمل کیا بلا ہے۔ آپ کے زمانہ میں بھی یہ چیزیں تھیں؟ بے فکر! :- (جواب تک خاموش تھا) جی کیوں نہیں، شاعری اورافیون سے کون پناہ میں رہا ہے۔ درویش :- ہمارے زمانہ میں شاعری موسیقی، مصوری، رقص وغیرہ کبھی کچھ تھے۔ اور ان چیزوں سے ہمیں فاصلہ لگاؤ بھی تھا۔ لیکن اب بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ ہمارے زمانہ میں فنون لطیفہ ہی نہیں ہر انسانی عمل کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدائے عمل کی تعبیر یا تجلید کرے۔ اب آپ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کہاں تک سائنٹفک ہے۔

ایک آواز :- لیکن سائنٹفک ہونے میں خرابی کیا ہے۔ میرے نزدیک تو انسانی ذہن و انسانی کارکردگی کا سب سے قابل فخر کارنامہ سائنس ہے۔

درویش :- اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن انسانی کارناموں کے اس پہلو پر بھی کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ انسان اپنے قوت بازو سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اُسے اپنے ہی قوت بازو سے قابو میں نہیں رکھ سکتا اُس نے سائنس کو تو پایا لیکن سائنس کے عواقب کو قابو میں نہ لاسکا۔ سائنس نے اُسے خارجی دنیا پر حملہ کرنے کے قابل تو بنادیا لیکن سائنس اس کی داخلی دنیا پر شخون مارتی ہے تو وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ سائنس کی مثال ایک ایسے اتحادی کی ہے جس سے اتحاد کر کے آپ دشمن کو زک پہنچا سکتے ہیں، لیکن وہ خود آپ کو بھی زک پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایک آواز :- جناب والا یہاں اس قسم کی باتیں نہیں ہو سکتیں۔

دوسری آواز :- کس قسم کی باتیں، جناب؟

پہلی آواز :- یہی اتحادی، شیخون، زک وغیرہ۔

ایک خاتون :- (برہم ہو کر) کیوں نہیں کیجا سکتیں؟ ضرور کیجا سکتی ہیں۔

پہلی آواز :- آپ سے کون کہتا ہے کہ نہ کیجئے۔ آپ نہ کریں گے تو کون کرے گا۔

(قہقہہ)

دوسری آواز :- خرابی تو اس وقت ہوتی ہے جب اس قسم کے الفاظ اصحاب فیل ادا کرنے لگتے ہیں

بے فکر :- ”اصحاب فیل“ کیا کر سکتے ہیں جب یہ (خواتین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ”طیرا بابل“ موجود ہیں! (قہقہہ)

ایک نوجوان :- اور کیوں قبلہ جدید ادب اور جدید مصوری کے نمونے بھی آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے، انکے

بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟

درویش :- اور آپ کا کیا خیال ہے؟

نوجوان :- میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں ہماری زندگی کے مطابق ہیں اس لئے مستحسن ہیں۔

درویش :- اس اعتبار سے مستحسن ہیں کہ وہ ہماری زندگی کے مطابق ہیں یا اس اعتبار سے کہ ہماری زندگی کو سدھارتے ہیں

نوجوان :- دونوں اعتبار سے

(قہقہہ)

بے فکر :- شاباش کیا داؤں خالی دیا ہے۔

درویش :- نہیں نہیں، انھوں نے بات ٹھیک کہی ہے۔ ہر وہ چیز جو زندگی کی برنائیوں کو بے نقاب کرتی ہو

زندگی کو آراستہ اور پاکیزہ کرنے کی بھی محرک ہو سکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ قدیم ادب اور مصوری

میں یہ چیزیں ناپید تھیں۔ یہ سائنس کا عہد ہے جس میں قدم قدم پر واقعیت کا مطالبہ کیا جاتا ہے

اور ہر چیز واقعیت کی کسوٹی پر کسی جاتی ہے۔ گزرے زمانہ میں لوگ مروجہ واقعیت سے بلند ہو کر

معیاریت کے طلبگار ہوتے تھے اور یہی سبب ہے کہ وہ زندگی سے ہٹ کر زندگی کو دیکھنا یا دکھانا چاہتے

تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طور پر وہ اکثر تصنع یا مبالغہ کی بھول بھلیوں میں پھنس کر کہیں سے

کہیں جا پڑتے تھے اور یہی سبب ہے کہ ضرورت سے زیادہ زندگی سے طوٹ ہو کر جدید ادیب

یا مصور اکثر بدگام و بدقوارہ ہو جاتے ہیں۔ بُری بات یا بُری شکل کے لئے لازم نہیں آتا کہ ادیب

قبیح الفاظ یا قبیح رنگ یا خط سے کام لے۔ جدیدیت کے حامیوں کا جائزہ لیجئے تو آپ کو محسوس ہوگا

کہ وہ قبیح واقعہ کا اظہار کرنا اتنا نہیں چاہتے جتنا خود اپنی فطرت کی بعض قبیح نوعیتوں کا مظاہر

کر کے تسکین حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ بُرائی بُرائی کی شکل میں نظر آئے نہ کہ

ادیب یا مصور کی شکل میں، گزشتہ زمانہ میں علم اور تجربہ کی وہ کارفرمائی نہ تھی جو اب ہے۔ چنانچہ قدما بنے بنائے یا مسلمہ اصولوں کو کام میں نہیں لاسکتے تھے۔ اس لئے لائحہ عمل اپنے وجدان یا تحنیل کو انتہائے حدود تک ہمیز کرتے چلے جاتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان میں واقعیت کے بجائے تخنیلیت یا رومانیت راہ پا جاتی تھی۔ اب بھی یہی ہوتا ہے یعنی آرٹسٹ بغیر تحنیل کے واقعیت کی اس بھی تعبیر نہیں کر سکتا۔ پہلے تحنیل کو واقعہ کا رنگ دینے کی کوشش کرتے تھے اب واقعہ کو تحنیل سے آراستہ کرتے ہیں پہلے مجرد سے مادہ کی طرف آتے تھے اب مادہ سے مجرد کی طرف مایل ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تھیٹر اور ڈراما کی تاریخ اس پر گواہ ہے۔

ایک شخص :- لیکن قبلہ، قدیم اور جدید کا فیصلہ کیوں کر ہوگا۔ آپ کا بیان جتنا دلچسپ ہے اتنا واضح نہیں ہے ریڈیو والا :- بس جناب مذاق نہ باشد ریڈیو پر فیصلہ نہیں ہو سکتا، صرف دلچسپی قائم رکھی جانی ہے۔ بس آگے نہ بڑھئے۔ وہی شخص :- (جلکر) لیکن قبلہ یہ کیا ضرور ہے کہ دلچسپی صرف چنی جان و مٹی جان ہی سے قائم رکھی جائے۔ آخر ریڈیو سننے والوں میں وہ لوگ بھی تو ہیں جنہوں نے لونڈیوں اور یکہ بانوں سے ملکر زندگی کے لحاظ عزیز پڑھنے اور سوچنے میں بھی صرف کئے ہیں۔

ریڈیو والا :- ہم کو تو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ عام پبلک کیا پسند کرتی ہے اور کیا ناپسند کرتی ہے۔ آپ ایسے لکھنا نہیں چاہیں شخص :- یہ آپ نے پبلک کو ہوا یا چھوٹی موٹی کیوں سمجھ رکھا ہو کہ وہ آپ کو یا تو کیا کھا جائے گی یا آپ اسے ہاتھ لگاتے جہنم واصل کر دیں گے۔ پبلک تولید روں کا افترا اور بھلے مانسو کی آبرو چاہتی ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔

بے فکر :- (گا کر) یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے ! (تہقیر)

درویش :- قدیم اور جدید کا فیصلہ محض حلیہ اور سن و سال کے اعتبار سے نہیں کیا جاتا۔

بے فکر :- (آہ سرد کھینچ کر) مجھے تو اتفاق ہے۔ ہمارا جھگڑا تو ان خواتین کا اٹھایا ہوا ہے۔

خواتین :- (ریزبان ہو کر) توہین، توہین، ہم اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔

بے فکر :- (نہایت خنجریں بھریں) مجھے بھی تو اسی کا رونا ہے ! (طیش میں آ کر) نہیں مانے گا تو۔

ریڈیو والا :- (طیش میں آ کر) نہیں مانے گا تو۔

بے فکر :- (دب کر) مانوں گا کیوں نہیں جناب ! (تہقیر)

ایک صاحب :- (درویش سے مخاطب ہو کر) ہاں قبلہ ارشاد ہو۔

درویش :- میں یہ عرض کرنے والا تھا کہ قدیم محض قدیم ہونے کی بنا پر نہ اچھا ہوتا ہے اور جدید بھی محض جدید ہونے کے اعتبار سے نہ اچھا

نہ برا۔ ہر جدید قدیم کا جنا ہوا ہے۔ ہر قدیم جدید میں زندہ ہوتا ہے، کوئی جدید قدیم سے ملکر نہیں کیا جاسکتا۔ قدیم و جدید کے اس تسلسل کا

دوسرا نام زمانہ ہے جو ابدیت کی روشنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے، جیسے چاندنی میں جگنو !

بے فکر :- (بے اختیار ہو کر) او ہو ہو جگنو، جس کے بارہ میں کہا ہو :- سب لوگ دیکھ دیکھ جاتے ہیں تالیاں۔ (تسلسل تالیاں)

رشدیہ احمد صدیقی

بعض سیاسی تصریحات

آج کل سیاسیات کا لٹریچر بھی بہت وسعت اختیار کرتا جا رہا ہے اور روزانہ اخباروں میں بعض اصطلاحیں ایسی نظر آتی ہیں جن سے لوگ ناواقفانہ طور پر گزر جاتے ہیں، حالانکہ جب تک ان کا صحیح مفہوم معلوم نہ ہو، مضمون کی اصل روح یا انتقادی رجحان سے بیگانگی رہتی ہے۔

دنیا میں متعدد سیاسی و معاشی ادارے پائے جاتے ہیں۔ بہت سے معاہدے ہو چکے اور ہوتے رہتے ہیں جن کا تعلق براہ راست بین الاقوامی سیاست سے ہے، اس لئے جب تک ہم کو ان کا پورا حال نہ معلوم ہو، ہم سیاسی مقالات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے اس اشاعت سے ایک سلسلہ ان اصطلاحات کا شروع کیا جاتا ہے جس کو ازمیات (Sims) مطبوعہ نگار اپریل ۱۹۴۷ء کے سلسلہ کی چیز سمجھنا چاہئے۔

منی کے ملاحظات میں معاہدہ برسٹ لٹوسک، معاہدہ ورسائی اور معاہدہ لوکارنو کا ذکر آچکا ہے، انہیں بھی اسی لٹریچر میں شامل سمجھنا چاہئے۔

جمعیت الاقوام (لیگ آف نیشنس)

گزشتہ جنگ عظیم کے اختتام پر جب معاہدہ ورسائی (Versailles) کی رو سے شرائط صلح مرتب کئے گئے تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے پایا کہ صدر امریکہ (ولسن) کے مقرر کئے ہوئے چودھویں اصول کے مطابق حکومتوں کی ایک انجمن قائم کی جائے جس کا صدر مقام جنیوا (سوئٹزرلینڈ) ہو۔

اس جمعیت یا انجمن کا اہم ترین مقصد دنیا اور علی الخصوص یورپ میں امن قائم رکھنا تھا اور اس لئے اس میں شامل ہونے والی تمام حکومتوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی حدود کا خیال رکھیں گی آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کریں گی اور اگر کوئی نزاع پیدا ہو گئی تو جمعیت اس کو طے کرے گی اگر جمعیت ۶ مہینے تک کوئی فیصلہ

نہ کرے تو اس کے بعد تین مہینے کا اور انتظار کر کے جنگی کارروائی شروع کی جاسکتی ہے۔

جمعیت نے یہ بھی طے کیا تھا کہ اگر کوئی حکومت جمعیت کے متفقہ فیصلہ کے خلاف دستبرد *Aggression* سے کام لے گی اور دوسری سلطنت پر ناجائز حملہ کرے گی تو آلات حرب و سامان جنگ وغیرہ کا داخلہ حملہ آور ملک میں باہر سے بند کر دیا جائے گا۔

اس جمعیت کا ایک اجلاس ہر سال جنیوا میں ہونا قرار پایا اور لیگ کی کونسل کا سال میں تین بار جمعیت میں شامل ہونے والی حکومتوں کی تعداد ۵۴ تھی اور کونسل کے ممبروں کی پندرہ۔ کونسل میں برطانیہ، فرانس اور روس مستقل ممبر قرار پائے باقی بارہ ممبروں کا تقرر انتخاب کے ذریعہ سے ہوئے۔ اس جمعیت میں بین الاقوامی مزدور سبھا کی نمایندگی بھی شامل تھی اور ایک بین الاقوامی عدالت بھی اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ وہ حکومتوں کی نزاع کو طے کرے۔

اس جمعیت کے قیام میں سب سے بڑی ابتدائی کمزوری تو یہ تھی کہ امریکہ اس میں شامل نہیں ہوا، دوسری کمزوری یہ تھی کہ جمعیت کی تنظیم مستحکم نہ تھی اور جو جمعیت کے پاس کوئی ایسی قوت نہ تھی جو اپنے فیصلہ کو بہ تسلیم کر سکے علاوہ اس کے جنگ عظیم کے فریقین میں جو اختلافات پائے جاتے تھے وہ بھی دور نہ ہوئے تھے اور اس لئے جمعیت کا نظام کوئی ایسا نظام نہ تھا جس کو تمام دنیا کی حکومتوں نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہو۔

جب ۱۹۳۵ء میں جرمنی نے بھی اس کی ممبری قبول کی تو تھوڑا سا اطمینان ہوا لیکن جب ۱۹۳۶ء میں اٹلی کا اقتدار ہوا تو جرمنی نے جمعیت کی ممبری سے استعفا دیدیا، کیونکہ اس کے نزدیک جمعیت، محض اتحاد بین کی ساختہ پر داختم چیز تھی اور اپنے ہی فائدہ کے لئے انھوں نے اسے قائم کیا تھا۔

جمعیت کی سب سے پہلی کمزوری اس وقت ظاہر ہوئی جب جاپان نے ۱۹۳۷ء میں چین کی حدود میں مداخلت کر کے منچور پر قبضہ کیا۔ جمعیت نے جاپان کی اس دستبرد کے خلاف بہت شور و داد مچایا، لیکن جاپان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکی، نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان نے ممبری سے استعفا دیدیا۔

دوسری ضرب جس نے جمعیت کے اقتدار کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا وہ تھی جب ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ پر حملہ کیا اور جمعیت نے اٹلی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومتوں نے جمعیت کو نہل چیز سمجھ کر پھر وہی خفیہ معاہدوں کے ذریعہ سے اپنے اپنے ہلاک علیحدہ طیارہ کرنے شروع کئے۔

اس کے بعد جرمنی کا آسٹریا اور یوگوسلاویہ پر قبضہ کر لینا اور جمعیت کا ماتھ پر ماتھ دھڑے پٹھے رہنا ایسا واقعہ تھا کہ آخر کار ۱۹۳۹ء سے جمعیت کا عملی وجود بالکل ختم ہو گیا اور اب وہ صرف کاغذی چیز بن گئی ہے۔

عہد شقاق اشتمالیت شکن (Anti Comintern Pact)

یہ اصطلاح تین ٹکڑوں سے مرکب ہے (۱) Anti یعنی ضد (۲) Comintern جو خلاصہ ہے Communist International مجلس اشتمالیین کا اور (۳) Pact بمعنی شقاق یا معاہدہ۔ اشتمالی تحریک کو دبانے کا معاہدہ۔

سب سے پہلے یہ معاہدہ ۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء کو جرمنی اور جاپان کے درمیان ہوا تھا، اس کے بعد ۶ نومبر ۱۹۳۷ء کو اٹلی بھی اس میں شامل ہو گیا۔ معاہدہ کے الفاظ یہ ہیں:-

”ہم دستخط کنندگان وعدہ کرتے ہیں کہ ”مجلس اشتمالیین“ (Communist

International) (جس سے مراد روس کی اشتمالی حکومت ہے) کی سرگرمیوں سے ایک دوسرے کو باخبر رکھیں گے اور اس تحریک کو دبانے اور اس سے محفوظ رہنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل کریں گے۔

اگر کوئی اور ملک جس کا امن و سکون اشتمالی تحریک کی وجہ سے خطرہ میں ہو، اس معاہدہ میں شریک ہو سکتا ہے۔

یہ معاہدہ نومبر ۱۹۳۷ء میں ختم ہو جائے گا لیکن ہم دستخط کنندگان ختم میعاد سے پہلے ہی اس کی توسیع کر سکتے ہیں۔“

دسمبر ۱۹۳۸ء میں ریاست متحہ کو بھی اس میثاق میں شریک ہو گئی اور فروری ۱۹۳۹ء میں ہنگری بھی۔ جب اپریل ۱۹۳۹ء میں جنرل فرانکو اسپین کی خانہ جنگی سے فارغ ہوا تو وہ بھی اس میں شریک ہو گیا۔ اس میثاق کو یورپ کی جمہوری سلطنتوں اور خصوصیت کے ساتھ برطانیہ نے اپنے خلاف ایک سیاسی معاہدہ سمجھا لیکن چونکہ اس میثاق کی رو سے اشتمالیت یا جمہویت کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا اس لئے کوئی زیادہ اہمیت اسے حاصل نہ ہو سکی یہاں تک کہ جب ۲۴ اگست ۱۹۳۹ء کو جرمنی اور سوویت حکومت کے درمیان مصالحانہ معاہدہ (Non aggression Pact) ہوا تو یہ میثاق بھی عملاً ختم ہو گیا یعنی جاپان و اسپین بھی جرمنی سے علیحدہ ہو گئے اور جب موجودہ جنگ شروع ہوئی تو اٹلی اور ہنگری نے بھی اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔

مصالحانہ پالیسی (Appeasement Policy)

اس سے مراد انگلستان کی موجودہ وزارت کی وہ پالیسی ہے جس کی رو سے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء میں

مسوینی اور ہٹلر کی زیادتیوں کو اس امید پر برداشت کیا گیا کہ شاید وہ کسی وقت راہ راست پر آسکیں اور بین الاقوامی اتحاد و تعاون کی پالیسی اختیار کر لیں۔

اٹلی کی فتح جیتے کو تسلیم کر لینا، جرمنی کے حملہ آسٹریا پر خاموش رہنا، اسپین کی جمہوریت کو جنرل فرانکو کے ہاتھ سے تباہ ہوتے ہوئے دیکھنا اور معاہدہ میونخ (جس کی صراحت آگے آتی ہے) یہ تمام باتیں برطانیہ کی اسی مصالحتی پالیسی کا نتیجہ قرار دی جاتی ہیں لیکن جب ۱۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو معاہدہ میونخ کے خلاف ہٹلر نے زیکو سلوواکیا پر قبضہ کر لیا تو مسٹر چمبرلین نے اس پالیسی کو ترک کر کے جرمنی کے مقابلہ کرنے کی پالیسی اختیار کر لی۔

محور روم و برلن (Berlin Rome Axis)

یہ اصطلاح اٹلی اور جرمنی کے سیاسی اتحاد کو ظاہر کرنے کے لئے وضع کی گئی ہے، یعنی جس طرح ایک گانڈی کے دو پیچھے ایک ہی محور یا ڈھرے پر گھومتے ہیں اسی طرح اٹلی اور جرمنی بھی ایک ہی مقصد کو سامنے رکھ کر کام کر رہی ہیں۔ جرمنی اور اٹلی کے اس محوری تعلق کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب اٹلی نے جرمنی سے مشورہ کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں حبشہ پر حملہ کیا۔ ۱۹۳۷ء میں ”معاہدہ اشتراکیت شکن“ کے بعد اس میں اور زیادہ استحکام پیدا ہو گیا اور ۱۹۳۹ء میں اس محور نے ایک سیاسی و فوجی اتحاد کی صورت اختیار کر لی۔

اس سے پہلے اٹلی اس بات کا مخالفت تھا کہ جرمنی دریائے ڈینیوب کی وادیوں میں اپنے اثرات کو وسیع کرے، چنانچہ جب ۱۹۳۷ء میں آسٹریا کے اندر نازی ہنگامہ شروع ہوا تو اٹلی نے مداخلت کرنا چاہی، لیکن جب اس نے حبشہ پر حملہ کیا اور دول مغرب نے اس کا بائیکاٹ کرنا چاہا تو یہ جرمنی سے مل گیا۔ اس اتحاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی حبشہ پر قابض ہو گیا اور جرمنی نے رہائش لینڈ لے لیا (جو گزشتہ جنگ عظیم میں جرمنی کے قبضہ سے نکل کر پندرہ سال کے لئے اتحاد دین کو مل گیا تھا)۔

اس کے بعد ”روم برلن محور“ نے جنرل فرانکو کو ابھار کر اسپین میں خانہ جنگی کرادی اور اس کو کافی مدد پہونچائی تاکہ اسپین میں نازی و فسطائی اثر بڑھ جائے، جب اس طرح یہ محور مضبوط ہو گیا تو جرمنی نے ۱۹۳۸ء میں آسٹریا پر قبضہ کر لیا اور اٹلی خاموش رہا اور اس نے کوئی مخالفت نہیں کی حالانکہ ہٹلر ہی اور یوگو سلاویا سے جن کی سرحدیں آسٹریا سے ملتی ہیں اٹلی کے اغراض بھی وابستہ تھے۔

۱۹۳۸ء میں ہٹلر اور مسوینی کی ملاقاتیں ہوئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ستمبر ۱۹۳۸ء میں ہٹلر نے زیکو سلوواکیا سے سوڈن لینڈ کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ حملہ کر کے اس پر قبضہ بھی کر لیا۔ ادھر مسوینی نے ہٹلر کو خوش

کرنے کے لئے یہودیوں کے خلاف وہی کارروائیاں شروع کر دیں جو جرمنی میں جاری تھیں، آخر کار اس اتحاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُدھر مارچ ۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے پورے زیکو سلوویکیا پر قبضہ کر لیا اور دوسری طرف اٹلی نے البانیا پر۔ یہ محور اس سمجھوتے پر قائم ہے کہ اٹلی بحر روم کے علاقوں میں اپنے اثرات وسیع کرے اور جرمنی یورپ کے وسط، اور جنوبی مشرقی علاقہ میں۔ اس اتحاد میں بعد کو جاپان بھی شریک ہو گیا اور اس طرح ”روم برلن محور“ نے ایک مثلث کی شکل اختیار کر لی جسے ”روم، برلن، ٹوکیو مثلث“ کہتے ہیں۔ اسپین اور ہنگری بھی بعد کو اس محور پر شریک ہو گئے جو خود بھی بلقان میں اپنے اثرات وسیع کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم وہ معاہدہ اتحاد ہے جس پر ۲۲ مئی ۱۹۳۹ء کو جرمنی اور اٹلی نے دستخط کئے ہیں۔ اس معاہدہ کی رو سے ان دونوں ملکوں نے طے کیا ہے کہ اپنی حکومتوں کو وسیع کریں گے اور دونوں ہر حال میں ایک دوسری کی مدد کریں گے۔

جب یہ جنگ شروع ہوئی تو اٹلی نے غیر جانبدارانہ پہلو اختیار کیا جس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ہٹلر نے اسٹالین سے ساز باز کر لی تھی، لیکن اس کے بعد جب ہٹلر اور مسولینی میں پھر ملاقات ہوئی تو رنگ بدلا اور اب اٹلی بحر روم میں اتحادیوں کے خلاف فوجی حرکت پر آمادہ نظر آتا ہے۔

معاہدہ میونخ (Munich Agreement)

جب اگست ۱۹۳۸ء میں ہٹلر نے زیکو سلوویکیا سے سوڈٹن لینڈ (Sudeten land) کے علاقہ کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ فوجی حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں تو مسٹر چمبرلین وزیر اعظم برطانیہ لڑائی کو روکنے کے لئے ہٹلر سے ملنے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس و برطانیہ نے زیکو سلوویکیا کو مشورہ دیا کہ تمام وہ علاقہ جہاں ۵۰ فی صدی سے زیادہ جرمن آبادی پائی جاتی ہے، جرمنی کے حوالہ کر دے۔ بعد کو جب اسی سلسلہ میں چمبرلین دوبارہ ہٹلر سے ملے تو ہٹلر نے اپنے زیادہ وسیع علاقہ کا مطالبہ کیا۔ اس پر چمبرلین ناخوش ہو کر واپس چلے گئے اور زیکو سلوویکیا کو فوجی اجتماع کا مشورہ دیکر اتحادیوں نے خود بھی فوجی اجتماع شروع کر دیا۔ اس واقعہ نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ جنگ کا ہونا ناگزیر سا ہو گیا، لیکن مسولینی کے مشورہ سے ہٹلر نے ایک اور کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کی، یہ کانفرنس ۲۸ ستمبر ۱۹۳۸ء کو میونخ میں ہوئی جس میں چمبرلین، مسولینی، ہٹلر اور ڈیڈلے (De Gaulle) فرانسیسی وزیر اعظم شریک تھے۔ اس کانفرنس میں ہٹلر نے کچھ خفیہ سی تبدیلی اپنی شرطوں میں کر دی جسے اتحادیوں نے تسلیم کر لیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہٹلر کو وہ سب کچھ مل گیا جو لینا چاہتا تھا اور آخر کار

یکم اکتوبر ۱۹۳۸ء کو جرمنی فوجیں زیکو سلوواکیا کے مفوضہ علاقہ میں داخل ہو گئیں۔

اس معاہدہ کی رو سے زیکو سلوواکیا کے جدید حدود کی حفاظت کی ذمہ داری دستخط کنندگان نے اپنے سرسلی تھی، لیکن چھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ ہٹلر نے معاہدہ اور دستخط کی پروا نہ کر کے پورے زیکو سلوواکیا پر قبضہ کر لیا اور اسی وقت سے اتحادیوں کی پالیسی جرمنی کے خلاف مائل بہ جنگ ہو گئی۔

بورژوا (Bourgeoisie) اور پروتاریا (Proletariat)

فرانسیسی لفظ ہے جس کے اصل معنی متوسط طبقہ کے ہیں۔ لیکن مارکس کی پیروی کرنے والے اشتراکین نے اس اصطلاح میں سرمایہ داروں، کارخانہ داروں، سوداگروں وغیرہ کو شامل کر لیا۔ یعنی کاشتکاروں اور مزدوروں کے علاوہ ہر خوشحال شخص اس اصطلاح میں داخل ہے۔

اسی کے مقابل پروتاریا طبقہ ہے جس میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو کسی قسم کی کوئی جایداد یا ملکیت نہیں رکھتے اور محض اپنی محنت سے پیٹ پالتے ہیں۔

بورژوا طبقہ کی اشتراکین نے دو تقسیمیں کی ہیں۔ ایک وہ جماعت جس میں بڑے بڑے سرمایہ دار، کارخانہ دار اور تاجر شامل ہیں، دوسری جماعت چھوٹے چھوٹے دوکانداروں اور کارخانہ داروں کی ہے۔

اشتراکین کا کہنا یہ ہے کہ موجودہ سرمایہ داری اور کارخانہ داری کے نظام نے بورژوا طبقہ کو تمام صنعتی ممالک میں حکمران جماعت بنا دیا ہے، اس لئے اس جماعت کے اقتدار کو منسٹ کر پروتاریا جماعت کا اقتدار قائم ہونا چاہئے تاکہ دولت کی تقسیم ایک جماعت کے اندر محدود نہ ہو جائے، اور سارا ملک اس سے فائدہ اٹھائے۔

”نگار“ کے پُرانے پرچے

”نگار“ کے مندرجہ ذیل پرچے دفتریں موجود ہیں جن کی دو دوتین تین کاپیاں دفتریں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(۱۹۲۶ء) جنوری ۵ء۔ (۱۹۳۰ء) مئی ۴ء۔ (۱۹۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ء فی پرچہ۔ (۱۹۳۲ء) جنوری ۱۲ء
فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ فی پرچہ۔ (۱۹۳۳ء) فروری تا جولائی ۴ فی پرچہ۔ اکتوبر ۵ء۔
(۱۹۳۶ء) جنوری ۵ء۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ فی پرچہ۔ (۱۹۳۷ء) جنوری ۵ء۔ مارچ تا اگست ۶ فی پرچہ۔
(۱۹۳۸ء) پورا فائل ۷ء۔ (۱۹۳۹ء) جنوری ۷ء۔ فروری تا نومبر (علاوہ اگست تا دسمبر) ۸ فی پرچہ۔
شیر نگار۔ لکھنؤ

ایک رات اور....

شیشی نے زور سے انگڑائی لی اور سر کو زور سے جھٹکا دیا جیسے کہ نیند کو وہ اس طرح اپنے اوپر سے دور پھینک دے گی مگر نیند تو اس کے سر پر چڑھی آرہی تھی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنی آنکھیں کھولے ہی رکھے گی اور اس ارادہ سے اس نے اپنی آنکھیں پوری کھلا لیں کہ — ”دیکھو اب نیند میری آنکھیں کیسے بند کرتی ہے“

مگر وہ نیند سے لڑنے میں جیتی ہوئی معلوم نہ ہو رہی تھی کیونکہ دو منٹ کے بعد اس کا سر اور زیادہ بوجھ سے جھکنے لگا۔ اس کی پلکیں آہستہ آہستہ مٹنے لگیں۔ اس نے پھر بھی اپنی آنکھوں کو پوری طرح بند نہ ہونے دیا۔ آدھی کھلی ہوئی آنکھوں سے وہ پھر بھی اپنے پی کے پیروں کے پاس مٹھی ہی رہی۔

گھر میں نے الارم بجایا، شیشی کی آدھ کھلی آنکھیں پھر پوری کھل گئیں۔ نیند کا بوجھ اس کے اوپر سے ہٹ گیا اس نے پھر انگڑائی لی اور پہلے کی طرح سر کو پھر زور سے جھٹکا دیا۔ اس نے گھر میں کی طرف دیکھا۔ بارہ بجے تھے۔ آدھی رات بیت گئی! اس کے چہرہ پر بکی سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے سوچا۔ ”ماں نے کہا تھا کہ بارہ بجے سے میں جاگوں گی۔ اچھا تو اب چل کر اپنا بستر ٹھیک کروں!“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ماں کے بستر کے پاس گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ ماں الارم کی آواز سن کر جاگ گئی ہوگی مگر وہ تو ٹس سے مس نہ ہوئی۔ گہری نیند میں بڑی خراٹے بھر رہی ہے۔ شیشی، ماں کی چارپائی کے پاس جا کر ٹھٹھک گئی۔ پھر سوچنے لگی۔ ”جگاؤں یا نہیں، لیکن جگانے میں ہرج ہی کیا ہے۔ انھوں نے خود ہی کہا تھا کہ اگر سوتی رہ جاؤں تو جگا لینا۔“ مگر ماں کو نہ تو پکارنے کے لئے اس کی آواز نکل سکی اور نہ اس کو بلانے کے لئے اس کے ہاتھ آگے کو بڑھ سکے۔ وہ اسی کشمکش میں خاموش کھڑی رہی۔ وہ یہ بھی سوچتی تھی کہ نہ جگاؤں؟ — لیکن وہ اس نیند کو کیا کرے جو کسی طرح مانتی ہی نہ تھی۔

دیوے کی دھیمی روشنی میں ماں کا جھڑپوں سے بھرا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بالکل بے خبر سو رہی تھی۔ بوڑھی ہونے سے پہلے وہ اس گھر کے بلے چوڑے صحن میں گھر کا کام کرتی ہوئی ایک کونہ سے دوسرے کونہ برابر پھرتی رہی ہوگی! اور تھکتے تھکتے بوڑھی ہو گئی۔ اب بڑھاپے میں بھی کیا شیشی گھر کی بہو ہو کر جی کی بوڑھی ماں کو کام کرنے پر مجبور کرے گی۔ اس کا بوڑھا جسم کھاٹ پر پڑا ہوا تھا اور پتلے پتلے ہاتھ پاؤں چادر سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس نے ان کو

چادر سے ڈھک دیا۔

ششی کا ہتی کراہا۔ ”پانی۔“ ششی دوڑی ہوئی گئی اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ اس نے صراحی سے گلاس میں پانی لیا اور پتی کو اپنے باہوں کے سہارے بٹھا کر اس کے ہونٹوں سے وہ گلاس لگا دیا۔ پھر اس نے اپنی باہوں کے سہارے اپنے پتی کو لٹا دیا۔ پتی کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے ششی کی طرف دیکھا ہی تھا کہ اس کی آنکھوں میں دکھ کی جھلک چمکنے لگی۔ ”ارے تم ابھی تک نہیں سوئیں!“ اور گہری سانس لے کر پھر ویسے ہی آنکھ بند کر کے لیٹ گیا۔ ششی اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی! پھر اس نے سوچا کہ اپنے پتی کو سلا کر سو جاوے گی۔ وہ بیٹھی نہیں کیونکہ اس نے جان لیا تھا کہ اگر وہ بیٹھے گی تو میند کے بوجھ سے وہ پھر دبنے لگے گی۔ وہ کھڑی ہی ہوئی اپنے پتی کے سو جانے کا انتظار کرنے لگی!

وہ کمرہ میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ دیوے کی دھیمی روشنی میں اس کا سارا کمرہ سو رہا تھا۔ صرف وہی تھی جو اب تک نہ سوئی تھی۔ کمرہ کے باہر سے بھی کسی قسم کی آہٹ کی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا اندھیرے میں خاموش ہو کر سو گئی ہے رات سائیں سائیں کر رہی تھی جیسے رات میں خراٹے لے رہی ہو! بچہ کی آواز نے ساری خاموشی کو ختم کر دیا۔

ششی کو یاد آیا کہ بچہ کے دودھ پینے کا وقت آگیا ہے۔ اس نے اسے تھپکیاں دے کر پھر سلا دیا اور لوٹے سے کٹوری میں دودھ اٹھنے لگی۔ دودھ میں انگلی ڈال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دودھ برف جیسا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ اس نے انگٹھی کی طرف نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ کوئی جھلکرا کر ہو گئے ہیں۔ اس نے راکھ کو چمٹے سے کر دیا مگر آگ کا ایک پتنگ بھی دکھائی نہ دیا۔ اس نے کاغذ لیا اور اسے انگٹھی میں رکھ کر دودھ گرم کرنے لگی۔ اسکی انگلی دودھ میں برابر پڑی رہی۔ میند کے بوجھ سے اس کا سر پھر جھکنے کو ہی تھا کہ بچہ کی آواز نے پھر اس کی میند کو بھگا دیا۔ وہ بچہ کو دودھ پلانے لگی۔ جیسے ہی وہ کٹوری سے چمچ بھر کر بچہ کے منہ میں دودھ ڈالتی تھی ویسے ہی وہ میند کی جھپکی لے لیتی تھی مگر جیسے ہی چمچ کا دودھ ختم ہو جاتا تھا ویسے ہی اس کا جھپکی لینا بھی ختم ہو جاتا تھا اور پھر وہ کٹوری سے دودھ کے چمچ نکالنے لگتی!

بچہ کو دودھ پلا کر اس نے بچے کو لٹا دیا۔ مگر بچہ رونے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ بغیر لیٹے ہوئے بچہ کبھی نہ سووے گا۔ اس لئے وہ بھی لیٹ گئی۔ مگر اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ سو نہ جاوے، اس لئے اس نے اپنی آنکھیں کھلی ہی رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ اور آنکھیں پہلے کی طرح پوری کھولے رکھیں۔ مگر میند کی مٹھاس سے اس کی آنکھیں پھر چمکنے لگیں اس کے پلک پھر چمکنے لگیں۔ مگر اس کے دماغ میں وہی خیال تھا کہ کہیں سو نہ جاؤں۔ ”نہیں۔۔۔ سو کیسے جاؤں گی۔ سو کیسے سکتی ہوں!“ وہ اپنے من کو سمجھانے لگی ”مجھے تو رات بھر جاگنا ہے! سو کیسے جاؤں گی؟“

مگر اس کی آنکھیں تو بند ہوتی جا رہی تھیں ! اس نے پوری طاقت سے اپنی آنکھوں کو کھلی رکھنے کی کوشش کی۔ گھڑی نے تین کا الارم بجا دیا۔ وہ چونک گئی۔ "تین بج گئے" اور ایک دم اس کے دماغ میں خیال آیا کہ پتی کو دوا دینے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ خیال کرنے لگی کہ اب دوا دے کر سو جاؤں گی۔ پانچ بجے تک میں خوب مزہ سے سو سکوں گی کیونکہ پانچ بجے اسے پھر دوا پلانے کے لئے اٹھنا ہوگا۔ پانچ بجے تک اسے کوئی کام نہ ہوگا۔ اس کا بچہ تو سو ہی رہا ہے اور سوتا رہے گا۔ بوڑھی ماں سو ہی رہی ہے۔ ان کو ان دو گھنٹوں میں پانی کی ضرورت تو پڑے ہی گی نہیں۔ بڑے لڑکے کا بھی کچھ کام نہیں ہے۔ اسے دھیان آیا کہ اس کی تختی ابھی تک صاف نہیں ہوئی مگر وہ صاف ہو جاوے گی، دو منٹ کا کام ہے۔ اس نے خوب اچھی طرح سے سوچ لیا کہ ان دو گھنٹوں میں اسے کوئی کام نہ ہوگا۔ اس نے وہ خوب سو سکے کے ارادہ سے اٹھی مگر اسے ایک دم خیال ہوا کہ پانچ بجے میری آنکھ نہ کھل سکی تو! ڈاکٹر کہہ گیا ہے کہ دوا دینے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہ ہونی چاہئے۔ دوا کو ٹھیک وقت پر دینا ہے۔ اوندھ۔ میں ایسی بے خبر تھوڑے ہی سو جاؤں گی۔ میں پتھر کی ہو کر تھوڑے ہی سو جاؤں گی جو کان پر الارم کا شور ہونے پر بھی پھر پھڑا کر نہ اٹھ سکوں! — اٹھ کیوں نہ سکوں گی!!

اس نے پتی کو دوا پلا دی اور سلا بھی دیا۔ اس نے ایک چکر بوڑھی ماں کی طرف لگایا اور دیکھا کہ بوڑھی ماں ایسی بے خبر سو رہی ہے جیسے کہ کوئی تھکا مسافر دور دور کی منزلیں طے کر کے سو جاتا ہو! اس نے اپنے بڑے لڑکے کے منہ کی طرف دیکھا وہ بھی بخیر سو رہا تھا اس نے چھوٹے بچے کا منہ دھیرے دھیرے چادر کھول کر دیکھا وہ بھی خاموش پڑا تھا۔ وہ چادر پائی پر بیٹھ گئی اور چادر اٹھا کر اس نے اپنی ٹانگوں پر ڈالی ہی تھی کہ وہ کسی کشمکش میں پھنس کر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ گھڑی میں ساڑھے تین بج گئے تھے۔ پانچ بجے اسے پھر اپنے پتی کو دوا دینے اٹھنا تھا۔ ڈر پڑھ ہی گھنٹہ تو تھا!۔ اس کی نظر بوڑھی ماں کی طرف چلی گئی اور سوچنے لگی کہ وہ تو چھ گھنٹوں میں بھی اپنی منہ پوری نہ کر سکی تھی!۔ میں کیا اٹھ سکوں گی اور دوا دینے میں ضرور دیر ہو جاوے گی" وہ یہ سوچ کر کانپ اٹھی۔

اپنی آدھی ٹانگوں پر چادر لپیٹے ہوئے بیٹھی رہی اور گھڑی کی طرف تاکتی رہی۔ جیسے ہوا کے جھونکے رک رک کر آتے ہیں اور سیڑیوں کو اپنے بوجھ سے بار بار جھکا دیتے ہیں ویسے ہی منہ بھی رک رک کر اس کے اوپر آرہی تھی اور اس کے سر کو بار بار جھکا دیتی تھی۔ جیسے ہوا کے جھونکے بار بار رک جاتے ہیں اور بار بار پیڑ اپنا اپنا سر اونچا کر لیتے ہیں ویسے ہی منہ کا جھونکا کر اس کے سر سے نکل جاتا اور وہ اپنا سر پھر اونچا کر لیتی۔ وہ پھر چاروں طرف مکرہ میں نگاہ پھینک لیتی اور پھر جھکنے لگتی!!

وہ ٹانگوں پر سے چادر اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے کے لئے کہ کھڑے کھڑے منہ اس کے اوپر کیسے چڑھے گی تو کیا وہ پانچ بجے تک ایسے ہی کھڑی رہے گی؟ اس کو خیال آیا کہ اس نے بڑے لڑکے کی تختی دھو کر نہیں رکھی۔

جب صبح ہی اس کی نظر تختی پر جا دے گی اور اس کو یہ صدا نہ دیکھے گی تو اس کا خون سوکھ جاوے گا اور وہ جلتا رہتا رہتا، روتا دھوتا کھاٹ پر سے اُٹھے گا۔ اس لئے اس نے تختی اٹھائی اور چلی اسے دھونے۔ شاید اسکے دھونے میں میندا سے نہ تادے۔ شاید میندا کو اس طرح سے وہ دھوکا دے سکے۔ اور جب تک وہ تختی دھوتی رہی میندا کو دھوکا دیتی رہی۔!!

آخر پانچ بج گئے۔ ششی تختی دھو کر اس کو ایک کونڈ میں کھڑی کر رہی تھی کہ الارم بج گیا! اس نے تیزی سے دوا کی ششی اٹھائی اور کپانچ کے گلاس میں ایک خوراک ڈال کر جلد ہی پتی کو اپنی باہوں پر اٹھا کر اسکے حلق میں ڈال دی۔ اس نے پھر کھڑی کی طرف دیکھا! پانچ بج کر آدھی منٹ ہو گئے تھے اس کے دل میں تسلی سی ہو گئی کہ اس نے پتی کو دوا ٹھیک وقت پر پلا دی۔

اس کے بعد اسکے پتی کی وہی درد بھری آنکھیں اس کے چہرہ پر جم گئیں اور وہی سوال ”سوئیں نہیں؟“ ششی نے کہا۔ ”سویرا ہو گیا!“

اس کے پتی نے ہوش سنبھالتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا تا کہ صبح کی روشنی اس کو دیکھ جاوے! مگر کھڑکی کے کواڑ بند تھے۔ وہ ان کواڑوں کی طرف کتنا ہی دیکھے مگر وہ کھل نہ سکتے تھے کیونکہ اس میں سے سویرے کی ٹھنڈی ہوا آنے کا ڈر تھا۔ اس نے پھر ششی کے منہ پر ڈال کر نا امید سا ہو کر آنکھیں بند کر لیں!!

پتی نے جیسے ہی اپنی آنکھیں بند کیں ویسے ہی وہ کمرہ کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ دروازہ کو دھیرے سے بند کر کے وہ دروازہ سے لگ کر کھڑی ہو گئی تاکہ اگر پتی کے کمرہ کی آواز سنائی دے تو وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر اندر چلی جاوے۔ کمرہ کے اندر بڑی گرمی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے میندا اور بھی اس کے اوپر جھکی پڑ رہی تھی۔ کمرہ کے باہر اس کے ماتھے سے صبح کی تازہ ہوا لگ رہی تھی جو کہ اپنے ساتھ اس کے میندا کے بوجھ کو اڑا کر لے جا رہی تھی! یہی ہوا جس کے ساتھ ششی اپنی میندا کو اڑا دینے کے لئے کھڑی ہے کسی کسی کو تھپتھپا کر سلا رہی ہوگی۔ یہی ہوا رات بھر چلی ہوگی اور اسی میں رات بھر اور سب سوئے ہوں گے سوائے ششی کے! ابھی گھر کے اندھیرے میں کہیں کہیں ہی اُجالا ہوا تھا۔ جیسے اُجالا اندھیرے کو کہیں کہیں دور کرتا آ رہا تھا ویسے ہی کہیں کہیں رات بھر کے سوئے ہوئے آدمی اپنی میندا کو الگ پھینک کر اٹھ رہے ہوں گے! اور جب سبوں کے اُٹھنے کا وقت ہوا تو کیا اب ششی کے چادر تان کر سونے کا وقت ہوا؟

سونا چاہتی تو آسانی سے سو سکتی تھی۔ وہ بوڑھی ماں تھوڑی دیر میں اپنی آنکھیں کھول ہی دے گی اور تھوڑی دیر میں اُٹھ ہی بیٹھے گی اور سات بجے دوا پلا ہی دے گی! اس کا چھوٹا بچہ سو ہی رہا تھا۔ اور اگر جاگتا تو ماں کو

تھپک کر سلا ہی دے گی اور اگر سووے گا بھی نہیں تو اس کو گود میں لیکر کھلانے بیٹھ ہی جاوے گی۔ اس کا بڑا بچہ اسکول جانے کی خود تیاری آج کر ہی لے گا۔ ”اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ خود تیاری بھی نہیں کر سکتا“ مگر اس کو گرم دودھ کیسے ملیگا۔ آج نہ سہی!۔ گھر میں اور چیز بھی تو ہے! لڈو بنے رکھے ہیں! ان کو ہی کھا کر چلا جاوے گا۔ وہ سو تو سکتی تھی مگر پھر بھی سووے گی نہیں!! وہ اپنے پی کو خود ہی اپنے ہی ہاتھوں سے ٹھیک وقت پر دوا دے گی۔ کیا پتہ بوڑھی ماں کو یا دن رہے اور وہ اپنے پوجا پاٹھ میں لگ جاوے۔ وہ اپنے چھوٹے بچے کی دیکھ بھال خود ہی کرے گی اور اپنے بڑے لڑکے کو اسکول جانے کے لئے تیار خود ہی کرے گی اور روزانہ کی طرح آج بھی دودھ گرم کر کے پلا دے گی!! اور اس کے علاوہ اسے اور بھی تو کئی کام کرنے ہیں۔ ماں کی پوجا کا سامان ٹھیک کرنا۔ روٹی بنانا۔ برتن مانجنا۔ بچوں کا منہ ہاتھ دھونا وغیرہ وغیرہ سب ہی کچھ اسے ہی تو کرنا ہے!! اس نے سوچا کہ جلدی جلدی یہ سب کام کر لوں۔ دوپہر میں وقت نکال لوں گی اور سو جاؤں گی۔

چارپائی کے چرمرانے کی آواز ششی کے کانوں میں آئی۔ وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ بوڑھی ماں نے کروٹ بدلی تھی۔ ماں نے چارپائی کے پاس پھیل کی آواز سن کر منہ پھیر کر دیکھا تو ششی کو اپنے پاس کھڑا دیکھا۔

”ماں - اٹھو - سویرا ہو گیا!“

”سویرا —————!“

”ہاں“

”اور مجھے جگایا نہیں؟! ہائیں!“

”جگا کر کیا کرتی۔ رات بھر مجھے میند ہی نہیں آئی۔ تم اٹھو۔ سویرا ہو گیا!“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ نہادھو کر فارغ ہو کر وہ بوڑھی ماں کا پوجا کا سامان ٹھیک کرنے میں لگ گئی۔ پوجا کے سامان ٹھیک کرنے میں اس کی آج خاص طور پر طبیعت لگ رہی تھی۔ شاید اس کے دیوتا اس سے خوش ہو جاویں! اس نے بہت دیر تک رگڑ رگڑ کر برتن دھوئے اور جب وہ خوب چکنے لگتے تو وہ ان کو ایک قرینے سے رکھ دیتی! اسکو اس وقت ایسا معلوم ہوا تھا کہ اس کے دیوتا کے آشیر باد کا ہاتھ اس کے سر پر ہے۔ اس کی میند اس وقت نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔

اس نے برتن صاف کر لئے تھے مگر پھر بھی اپنے دیوتا کے ہی پاس بیٹھی رہی! اتنے میں بڑا لڑکا جاگ کر کمرہ سے باہر آیا اور اس کی چلاہٹ نے ششی کے دھیان کو تتر بتر کر دیا۔ ”ارے! آج تو اور روز سے دیر ہو گئی۔“ اور ابھی تو دودھ بھی نہیں —————!“

کیا کہ یہ بہتر ہوگا اگر آدھ گھنٹے اور رک جاوے!۔ روٹی بنانے کے درمیان میں وہ کہاں اٹھتی پھرے گی! آدھ گھنٹہ کی دیری کچھ دیری نہیں ہوتی۔ اور اتنی دیر میں ماں بھی پوجا سے فارغ ہو جاوے گی۔ اور۔۔۔ کھلا پلا کر۔۔۔ کھابی کر۔۔۔ سو جاوے گی!! رات کی نیند پوری کرے گی جس کا اس کے سر پر اتنا بوجھ تھا! نونج گئے! اس نے دوا پلا دی۔ اس نے جلدی سے اپنی نگاہ اس کو نے میں بھینکی جہاں ماں پوجا میں بے خبر سی بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی اس نے ماں کو پانی کے چھینٹے دیتے ہوئے دیکھا تو اس نے سمجھ لیا کہ اب پوجا ختم ہونے والی ہے! کہ اب ماں اُٹھ کر آ جاوے گی اور اس کے بچے کو گود میں لے کر دو گھنٹے کھلاوے گی۔ جیسے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھی ویسے ہی شمشی نے بچے کو گود میں اٹھایا اور ماں کی طرف جلدی! ماں نے بچے کو گود میں لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔۔۔ ”ارہی میں بنا دیتی۔۔۔“

”ارے یہ بھی کوئی بات ہے! بڑھاپے میں بھی کیا تم۔۔۔ سے چو لھا پھسکواؤں گی!“ یہ کہہ کر شمشی رسوئی گھر میں چلی گئی!

حالانکہ اس کی آنکھیں موندی جا رہی تھیں اور اس کے اوپر نیند کی سستی سوار تھی مگر پھر بھی اس کا ہاتھ چکے پر بڑی تیزی سے چل رہا تھا! جیسے ہی وہ ایک روٹی بیل کر توے پر ڈال دیتی تھی! ویسے ہی وہ خیال کر لیتی تھی کہ اس کے سونے کا وقت قریب آتا جا رہا ہے! اس نے پہلے خیال کیا کہ روٹی بنا کر اور سب کو جلدی سے کھلا کر وہ چار پائی پر لیٹ جاوے گی۔ پھر کسی کی دھمکے کی! چاہے اس کے کانوں پر نقارے ہی کیوں نہ بجن اٹھیں۔ اس نے بعد میں سوچا کہ وہ روٹی بنا کر رکھ دے گی۔ روٹی بنانا تو اس کا کام ہے۔ کھانا تو دوسروں کا کام۔ وہ بنا کر رکھ دے گی اور سب بعد کو جسکو بھوک لگے گی آپ ہی کھالینگے! نبھے اس کا انتظار دیکھنے کی کیا ضرورت! میں تو روٹی بنا کر ہی جاؤں گی! میں کھاؤں گی بھی نہیں! بعد میں دیکھا جاوے گا۔۔۔ اور بھوک بھی تو نہیں ہے! اگر اس نے طے کر لیا کہ وہ برتن بھی سونے سے پہلے نہ مانجے گی شام کو جب دوبارہ روٹی پکانے کا وقت ہو گا جب ہی مانجے لے گی! چلے جب وہ برتن مانجے! اسکی مرضی! مانجے تو اسی کو ہیں!

وہ ایسے ہی خیالات میں گم تھی کہ اس کی پر رات کا سارا آٹا ختم ہو گیا! اس نے ایک دم رسوئی گھر کے باہر نگاہ دوڑائی جیسے کہ ایک پرندہ پھرے کا دروازہ کھلتے ہی اپنی نگاہ اس کے باہر دور تک پھینک دیتا ہے وہ بھاگی ہوئی ماں کے پاس گئی! اس نے سوچا تھا کہ ماں سے کہہ آوے کہ اس نے روٹی پکا کر رکھ دی جب بھوک لگے کھالینا اور کھلا دینا۔ مگر وہ کہتے کہتے رک گئی! اس چھوٹے بچے کو دودھ پلانا وہ ایسی جلد بازی میں بالکل ہی بھول گئی تھی! اس کا خیال تو اس کو بالکل ہی نہ رہا تھا۔ اس نے اسے گود میں لیا اور رسوئی

کی طرف چل دی دودھ گرم کیا اور پلایا۔ اور جب ماں کو واپس دینے کو آئی تو خیال آیا کہ گیارہ بجنے کے بعد اسے پھر دوا دینی ہے وہ اس کمرہ میں ہی دوا کی شیشی کے پاس ہی بیٹھ گئی تاکہ جیسے ہی گیارہ بجیں وہ دوا اپنے پتی کو دیدے۔ اس نے سمجھ لیا کہ دوا پلانے کے بعد ہی وہ سو جاوے گی!

”گیارہ بج گئے۔ اس نے وقت پر ہی دوا پلا دی۔“

”اچھا، اب میں جاتی ہوں ماں۔۔۔ سولوں ذرا۔۔۔ تم کھانا کھا لینا۔۔۔ دو گھنٹہ بعد۔۔۔“

”ہاں، دیدی جائے گی دوا۔۔۔۔۔ دو گھنٹہ بعد۔۔۔“

”بھولو آوے تو۔۔۔“

”ہاں، تو جا۔۔۔ بھولو کو کھانا کھلا دیا جاوے گا۔۔۔ تو جا سو رہ۔“

”تو وہیں کھانا رکھا ہے!“

”اچھا، اچھا۔۔۔“

شیشی خلی گئی۔ تو ماں نے بھریکار کر کہا:۔

”تو نے کھا لیا؟“

”نہیں۔۔۔ ابھی نہیں!“

”تو۔۔۔!“

”سو کر کھالوں گی!“

”تو بھوک پیاسی سو جاوے گی؟“

”ابھی بھوک نہیں ہے!“

یہ بکروہ چلی گئی! اور اپنے کمرہ میں جا پہنچی۔ اس کی چار پائی پر بہت سے کپڑے اکٹھے ہو گئے تھے۔ دونوں بچوں کے سارے میلے کپڑے وہاں تھے جن کو وہ کئی دن سے دھونے پاتی تھی! وہ سوچنے لگی کہ کیسے ان کو دھونے کے لئے وقت نکالا جاوے۔ مگر وہ سونے کے لئے آئی ہے کہ یہ سب سوچنے کے لئے۔ وہ کپڑے دھونے کے لئے وقت نکالنے کے لئے تھوڑے ہی آئی ہے۔ اس نے اپنا بستر چار پائی پر بچھانا شروع کر دیا۔ اس کے بستر کی چادر کتنی گندی ہو گئی تھی وہ دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی مگر جیسے اور دن اسے چادر بدلنے کا وقت نہیں ملا تھا، ویسے آج بھی تو نہیں ہے۔ اور ابھی تو وہ سونے جا رہی ہے۔ چادر بدلنے تھوڑے ہی جا رہی ہے۔ چادر بدلنے میں جتنی دیر لگے اتنی دیر میں وہ اپنی منہ بھرے گی! اس نے چادر پوری طرح سے بچھائی۔ دو تین سوراخ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ ”اچھا، چنے سوئی ڈورا کہاں پڑا ہوگا“ جتنی دیر وہ سوئی

ڈورا ڈھونڈنے میں لگا دے گی اتنی دیر وہ سوئے گی نہیں؟ اور روزانہ بھی تو وہ پچھٹے پر سو جاتی تھی، آج بھی ویسے پر ہی سو جاوے گی۔ اس نے اپنے میلے پچھٹے ہوئے تکیے کی بھی کوئی پروا نہ نہیں کی۔ اس پر بھی اسے نیند آ جاوے گی اس نے اپنی ڈھیلی کھاٹ کی بھی فکر نہیں کی۔ وہ جھولی ہوئی کھاٹ پر بھی آج بے خبر ہو کر سو جاوے گی! وہ لیٹ گئی اور اسنے آنکھیں بند کر لیں۔ اب وہ نیند بھر کر ہی اٹھے گی۔ ساری رات جاگی ہے۔ ساری رات کی نیند پوری کرے گی۔ کھاٹ پر لیٹتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بھرا گئے کا منظر سامنے آ گیا۔ وہ خوب اچھی طرح سے اس وقت خیال کر رہی تھی کہ رات بھر اس نے کس طرح نیند سے جدوجہد کی ہے اور کس طرح سے اس کو ہر موقع پر دھوکا دیا ہے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ مگر اس نے ایک دم زور سے سر ہلا دیا جانو کہ وہ اپنی ہی مسکراہٹ پر جنجھلا اٹھی ہے۔ وہ ایسے سوچے گی اور بار بار مسکرائے گی تو سو کیسے سکے گی؟ اور وہ سونے کے لئے ہی تو لیٹی ہے۔ اس نے سوچا کہ اب کسی طرح کے خیال کو اپنے دماغ میں نہ گھسنے دے گی۔ اسنے پیر پھیلانے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ کانوں کو شور و غل سے ہٹا لیا۔ اس کے کان پر نکھیوں کی سی جنجھناہٹ سنائی دینے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے طرح طرح کی تصویریں بننے لگیں! اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔ اسکے دماغ میں طرح طرح کے خیال بھرا آئے۔ آدھ گھنٹہ اسے کروٹیں بدلتے ہو گیا مگر اسے نیند ہی نہیں آئی۔ حالانکہ اس کی آنکھیں جاگنے کی وجہ سے بھاری ہو رہی تھیں۔ اس وقت اسے نیند پر کافی جھونچل آرہی تھی۔ کاش وہ اسے نوچ ناچ کر اپنے اوپر سے پھینک دیتی! پھر وہ آنکھ بند کر کے لیٹ گئی۔ اب کہ اسکے سامنے ان برتنوں کا منظر ناچنے لگا جو کہ وہ بغیر مانجے ہوئے چھوڑ آئی تھی! اسے خیال آنے لگا کہ دو گھنٹہ کی نیند کے لئے وہ بہت سا کام چھوڑ آئی ہے۔ پھر وہ چڑھ کر کہنے لگی۔ ”بھاڑ میں جائے کام! اب نیند لینے آئی ہوں کہ کام سوچنے آئی ہوں!“ اسنے پکڑا رہا کہ چاہے جتنا ہی کام کا خیال آوے وہ اٹھے گی ہی نہیں۔ اگر اسے نیند نہ آوے۔ تو نہ آوے مگر وہ اٹھے گی نہیں! اسے اسی درمیان میں خیال آیا کہ وہ بچہ کا منہ دھو کر نہیں آئی ہے۔ صبح سے اس کا منہ دھویا ہی نہیں۔ ”اونہ۔۔۔ آج نہ دھولا تو کیا ہو جائے گا۔“ ”کیسا گندا ہو رہا ہوگا اس کا منہ۔“ نکھیاں جو جنجھنا رہی ہوں گی!!“ ”اونہ۔۔۔! جنجھنانے دو!“ اس نے کروٹ بدل لی۔ مگر اب وہ خیالوں کی رو کو کیسے بھی نہ روک سکی۔ خیال ایک کے بعد دوسرے اسکے دماغ سے آ کر ٹکرانے لگے!

وہ جلدی میں رسوئی کا سامان بے ترتیب بکھرا ہی چھوڑ آئی ہے۔ ماں اندھی دھندھی سی جاوے گی تو کہیں اس کے ٹھوکر نہ لگ جاوے۔ اسے رسوئی گھر کا سامان ترتیب سے لگانا ہے!

اور وہ برتنوں کا ڈھیر کا ڈھیر!! اگر سونے کے بعد شام گھوما جائے گی تو کیا بارہ بجے کھانا بناوے گی اور پھر وہ برتنوں کا ڈھیر پڑا ہوا کتنا برا معلوم ہوتا ہوگا۔ اسے اس ڈھیر کو بھی صاف کرنا ہے!

اس کوچہ کا ہاتھ منہ ضرور ہی دھونا ہے۔ مکھیاں جو بھنبھنا رہی ہوں گی! —
 اور وہ بچوں کے میلے کپڑوں کا ڈھیر! چھی! کتنے گندے ہو گئے ہیں! اسکو کراہت سی ہو آئی۔
 کتنے ہی دنوں سے وہ ان کپڑوں کو دھونے کے لئے کل کل کرتی آئی تھی۔ تو کیا وہ ایک گھنٹہ اپنی طبیعت پر جبر
 ڈال کر ان کپڑوں کو دھونے کے لئے بیٹھ نہیں سکتی! اسکو ان کپڑوں کو بھی دھونا ہے! پھر بہت دنوں کی فرصت ملیگی۔
 اور اس کو ماں کے سر میں تیل ڈالنا ہے! ان کی چٹیا کرنی ہے کتنے دنوں سے وہ کہہ رہی ہیں مگر وہ روزانہ
 کسی نہ کسی کام کا بہانہ کر دیتی ہے۔ یہ بھی اسے کرنا ہے!

اور ایک بچے۔ اور تین بچے اسے اپنے پتی کو دوا بھی تو دینی ہے! اور دوا تو وہ اپنے ہی ہاتھ سے ٹھیک
 وقت پر دے گی۔ وہ پہلے دن کی بھول کبھی نہ کرے گی جب کہ دوا دینے میں دیر ہو گئی تھی۔ اور جس سے کہ مرض
 بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر نے اس سے کہہ دیا تھا۔ ایک بچے تو اسے دوا دینے کے لئے اٹھنا ہی
 پڑے گا۔۔۔۔۔ اور تین بچے دوا دیکر پھر اسے کھانا پکانے کی تیاری کرنی ہے اور چھ بچے تک کھانا بنانے کے ہی
 کام میں لگی رہے گی! میند اس کے اوپر کتنی ہی جھکے۔ میند چاہے اس کی پاکوں کو بالکل ہی چپکا دے۔ چاہے اسکی
 گردن کو بالکل ہی جھکا دے مگر اسے تو کام کرنا ہے ہی! چاہے پاکوں کو بند کئے یا گردن کو جھکائے ہوئے کرے!!

”اماں!“

بڑے بچے کی آواز نے میند کے پردہ کو جو اس کی آنکھوں کے سامنے چھایا ہوا تھا بالکل ہی بھاڑ دیا۔ وہ
 اسکول سے لوٹ کر آیا تھا اور وہ روزانہ کی طرح بغیر کسی کے خیال کے گھر میں شور و غل مچاتا ہوا گھسٹا تھا! ششی کو
 ایک دم ایک اور خیال آیا کہ سب کو کھانا بھی تو کھلانا ہے اور بڑے لڑکے کو تو وہ اپنے ہاتھ سے ہی کھلا دے گی۔
 نہیں تو وہ ماں کو۔ بوڑھی ماں کو تنگ کرے گا۔ اس کا روٹی! دھرا دھرا پھینکا، بات بات پر چڑھنا۔ روٹھ روٹھ کر
 کھانا دہی سہ سکتی ہے کیونکہ وہ ہی ہمیشہ سے سہتی آئی ہے!!

ششی چار پائی پر سے کھڑی ہو گئی۔ ارادہ تو اس نے کر ہی تھا کہ وہ اٹھے گی نہیں! چاہے اس کے
 کانوں پر الارم کا تو کیا کہنا تقاروں کا بھی شور ہو! چاہے اس کے کانوں پر کھیوں کی بھنبھناہٹ ہو یا اس کے
 دماغ میں بے ترتیب خیالوں کا جھگمگ! جب وہ چار پائی سے اٹھی تو میند الگ کھڑی ہو گئی مگر جب وہ کمرہ میں سے
 نکلی تو میند اس کے پیچھے پیچھے ہی چل رہی!

ششی نے منہ منا کر بچے کو کھانا کھلایا۔ بچہ کے منہ ہاتھ دھوئے۔ ایک بچے دوا دی۔ رگڑ رگڑ کر اور زور
 زور سے ہل کر برتن مانجے۔ ایک گھنٹہ میلے کپڑے دھوئے۔ ماں کے سر میں تیل ڈالا اور جب اپنے سر میں تیل ڈالنے
 جا رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ گھڑی میں تین بجے ہیں تین چار منٹ ہیں۔ تیل کی ششی ایک طرف رکھ کر وہ

دوڑی ہوئی گھڑی کے پاس دو الی شیشی لے کر بیٹھ گئی۔ تین بجے دو ادھی۔ کھانا بنایا۔ شام ہو گئی۔ پھر کھانا بناتی رہی۔ آنکھیں بند کئے اس نے برتن مانجے۔ اندھیرا ہونے لگا!!

گھر کا سارا کام ختم کر کے وہ کمرہ میں گھسی۔ مینڈ بھی اس کا پتہ پکڑے۔ ہوئے شیشی کے پیچھے پیچھے داخل ہوئی اس نے اپنی نگاہ اپنی چار پائی پر ڈالی بھی نہیں تھی کہ بجے چلا دیا! ”اچھا اچھا تجھے بھی دودھ پلاتی ہوں“ اور دودھ گرم کر کے پلایا۔

پہلی رات جیسی یہ بھی رات ہے! ویسا ہی اندھیرا اب بھی چھا گیا ہے! اور ویسا ہی سناٹا اب بھی ہے۔ اور اسی طرح سے نیند اپنے پر پھیلائے ساری دنیا پر چھا گئی ہے! کمرہ میں وہی دیو اٹھتا رہا ہے! مندی روشنی سارے کمرہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ شیشی اب بھی دو الی شیشی لئے گھڑی ہے! اس نے دیسی ہی انگریزی لی اور زور سے سر ہلایا۔ اور آنکھیں پوری طرح سے پھاڑنے کی پھر کوشش کرنے لگی! وہی الارم بھرجا۔ اس کا نیند کا جھلملا پردہ پھر ٹوٹ گیا! بارہ بجے تھے۔ آدھی رات بیت گئی! اس کی نگاہ بوڑھی ماں کی چار پائی کی طرف دوڑ گئی۔ وہی زندگی کے کوسوں سفر سے تھکی ہوئی اب بھی چار پائی پر بے خبر ٹپتی ہے! وہ جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ اب بھی اس دیوے کی مندی روشنی میں دیکھ رہا ہے! وہی پتلے پتلے پیر اور ہاتھ اب بھی چادر سے مکے ہوئے ہیں۔ پہلے کی طرح شیشی نے ان کو بھر دھک دیا۔ اس رات بھی اس کی سونے کی جگہ خالی پڑی تھی! اس رات بھی کیا وہ اپنی آنکھ کو نہ جھپکنے دیگی؟۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔

اس کو اس رات بھی ویسے ہی بغیر آنکھ میچے جاگنا ہے! جیسے اور راتیں نکل گئیں ایسے ہی ایک رات اور سہی! ایک رات اور بھی ویسے ہی نکل جاوے گی۔ ایک رات اور وہ جاگے گی! مگر معلوم نہیں ایسی ہی راتیں وہ کتنی اور بتاوے گی! ”ایک رات اور“ کہہ کر ہی کیا وہ ہر رات کو بتانے کے لئے کمر کس لیا کرے گی؟ وہ اپنے آپ تو کبھی نہ سووے گی! کیونکہ اس کو دودھ گھنٹوں بعد دو ادھنی ہے۔ ٹھیک وقت پر! بوڑھی ماں کو یاد رہے یا نہ رہے۔ دوا تو اسے ہی دینی ہے۔ اور ماں کو کیوں جگاوے! بڑھاپے میں ان کو تو آرام ملنا ہی چاہئے اس لئے وہ رات کو نہیں سووے گی۔ دن میں بھی کیسے سونا ہو سکتا ہے! وہ گھر کا کام ماں سے تھوڑے ہی کرانے بیٹھے گی! شیشی گھر کی بہو ہے نا؟ تو کیا وہ گھر کی بہو ہو کر گھر کا کام ماں سے کرانے بیٹھے گی! اس لئے وہ دن کو بھی سووے گی نہیں۔ مینڈ ہی اگر بُری طرح سے اس کے اوپر جھک پڑے اور اس کو بے ہوش کر کے گراوے ایسی حالت میں تو ضرور وہ جہاں ہوگی وہاں پڑ جاوے گی!!

شکر سرور پ بھٹنا گرا ایم۔ اے

آسمان زمین اور سورج کی کہانی

آسمان :- کہونھی اچھی ہو؟
زمین :- آداب آداب شکریہ پر آبا آپ سے تو مجھے بڑا لگہ ہے آپ کوئی ایسے دور بھی نہیں، مگر خبر بھی نہیں لیتے کہ بیٹی جیتی ہے یا مر گئی ہے (روکو) اول - اول -

آسمان :- ننھی تمھاری یہ عادت نکئی کہ بات پیچھے اور اول اول پہلے مجھے بیسیوں کام اور ہیں۔
زمین :- آبا تو میرا اور کون ہے؟ جس کے آگے اپنے دکھڑے روؤں۔ وہ (سورج) روٹھے ہوئے، بیٹا چاند پاگل ہیں ایسی نصیبوں جلی تھی کہ جس کے گھر تہنی بیویاں پہلے تھیں۔ وہیں مجھے جھونک دیا۔ اماں کہہ ہشاں کو یہ میاں سورج ایسے انوکھے دکھائی دئے کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ عقد کر دیا۔ چار دن کا سہاگ اور ساری عمر کاروگ، میرا قصہ پاک کرایئے۔ جو ماشہ تولہ روشنی میری غذا ہو گئی وہ کسی کے دروازے سے بھیک مانگ لوں گی۔ پیٹ ہی پالنا ہے سو خدا مالک ہے مگر مجھے اس گھر میں رہنا منظور نہیں۔ غضب خدا کا سو دفعہ چیخ چکی ہوں کہ بیٹے کا علاج کرو۔ درسہ بٹھاؤ مگر وہ سنتے ہی نہیں۔ بیٹا ایسا نا فرمان ہے کہ اُسے اپنی آنکھ مچولی کے کھیل سے فرصت ہی نہیں کہ مجھ سے دو لفظ پڑھ لے، اتنے بڑے کو مارتے بھی شرم آتی ہے جو کبھی ایک تھپڑ لگاتی ہوں تو نگوڑا ناطاقتی سے نیلا پڑ جاتا ہوں۔ اماں، آبا کچھ تو کہئے اول اول آسمان :- تمھاری رام کہانی کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ مفت میں میرا دلغ پریشان کرتی ہو اور بھی کوئی بات ہو کہ بس یہی! زمین :- اول - اول -!

آسمان :- اچھی ننھی رومت۔ میں تمھاری اماں سے ذکر کروں گا۔
کہکشاں :- ننھی یہ کیا تمھاری عادت ہے کہ ایک کی چار چار کر کے لگاتی ہو، بوڑھے باپ کو اس طرح فضول کا رنج دینا۔ جو مقدر میں تھا سو ہو گیا۔ صبر کرو۔

زمین :- اماں آگ لگے صبر کرو۔ آخر کہاں تک؟ نہیں تم ہی ہو خدا کے فضل سے لونڈیاں، ماماں، گھر، فرش، تمھارے پاس سب کچھ تمھیں کیا پتہ کہ بیٹی پر کیا ہوتی۔ مرد کی بے پروائی کچھ گھر والی ہی سے کوئی پوچھے (روکو) کئی سال سے میرے سر میں دو ٹانگ والی جوؤں کا نور ہے ایسے نکھٹو کے گھر میں تم نے ڈالا کہ دو پیسے کے صابن کے لئے بھی حیران

ہوں نہ لونڈی نہ باندی نہ بہن نہ بیٹی کہ میرا تو دھلا دیں اس مصیبت سے تو رہائی ہو۔ اب اسے تو میں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا کہ وہ کہیں گے ننھی خبطن ہے۔

کہکشاں :- (آہ بھر کر) بیٹی اللہ کرے میرا وہم غلط ہو، مگر یہ دو ٹانگ والی جوں کب سے ہے؟

زمین :- (سہم کر) کیوں اماں کیا یہ بری قسم کی جوں ہے؟

کہکشاں :- (بیٹی کا خوف دور کرنے کے لئے) نہیں بری قسم کی نہیں تمہاری کئی اور بہنوں کو بھی بیٹی اور آخر مٹ گئی مگر سچ پوچھو تو اس کی خارش کی تکلیف بہت ہے اور میں تو اسی لئے تمہاری شادی اس اجڑے دیار میں کی تھی کہ یہاں اس جوں کا نام تک نہ آیا تھا۔ اچھا بتاؤ تو سہی کب سے ہے کیا تکلیف ہے؟

زمین :- اماں، ایمان کی بات ہے ابھی تک مجھے زیادہ تکلیف نہیں پہلے تو مجھے واقعی پتہ بھی نہیں چلا لیکن اب کچھ عرصہ سے یہ جوں گویا میرے چرے میں گھسی آتی ہے جسم کے اوپر دوڑتی ہے کبھی کبھی تو بہت بُری طرح کاٹتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی سوراخ کر کے کچھ مکاٹتا ہو۔ غضب کی لڑاکا ہے۔ باقی سب قسم کی جوں کو مارتی ہے کھاتی ہے لادتی ہے۔

کہکشاں :- ننھی تم نے تو میری جان نکال لی تھی۔ کتنا بات کو بڑھاتی ہو۔ زیادہ تکلیف نہیں تو کچھ ڈر نہیں۔ اسکی آفرینش ہی اسی قسم کی ہے کہ چند سال بہت بڑھتی ہے پھر آپس ہی میں کٹ مرتی ہے۔ ابھی یہ کچھ دنوں اور تمہارا پنڈا کریدے گی سوراخ کرے گی، لڑتی پھرے گی۔ بڑی بڑی پھنسیاں پیدا ہوں گی اور پھر یہ خود ہی ان پھنسیوں کو چیرے گی اور چیرنے میں ایک دوسرے کو فنا کر دے گی۔

زمین :- یہ کیا قصہ میں نے بیٹھی۔ اماں تم سے ایک بات پوچھنے کو تھی۔ سنا ہے کہ دوسری ریاستوں میں آج کل اصلاح کا بہت چرچا ہے۔ ہمارے ہاں تو اصلاح کے لفظ سے بھی کان نا آستا ہیں۔

کہکشاں :- بیٹی تمہاری یہ ریاست تھوڑی ہی ہے سورج جیسے سیکڑوں جاگیر دار تو تمہارے آبا کی ریاست ہی میں ہیں اور تمہارے آبا کی ریاست کچھ ایسی بڑی نہیں۔ ہمارے ساتھ ملتی ہوئی دس بیس ریاستیں ہیں اور کئی ہم سے بہت بڑی زمین :- اے بی اماں رہنے بھی دو آبا کی ریاست سے کیا کسی کی بڑی ہوگی۔ میں تو ہمیشہ یہی سمجھتی رہی کہ آبا نہ صرف گھر کے رئیس ہیں بلکہ بڑی سرکار میں مارا ملہام بھی ہیں اور ان کے آگے کسی کی کیا چلے گی۔

کہکشاں :- مارا ملہام تو خاک بھی نہیں۔ صرف چونکہ ہم لوگ سرحدی ہیں۔ اس لئے آؤ بھگت ہماری زیادہ ہے ورنہ کئی ایسے ہیں جو تمہارے آبا کو خرید لیں اور محسوس بھی نہ کریں۔ بیٹی ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے ایک گھر سے نکلیں دوسرے گھر میں بند وہ بھی ایک طرف گو۔

زمین :- ابھی امی یہ بتاؤ کہ کیا اصلاح ہوگی۔

کہکشاں :- بیٹی مجھے صحیح علم تو نہیں۔ مگر سنتی ہوں کہ تمہارے آبا پر ہم چشموں نے بہت بہت چوٹیں کی ہیں کہ انتظام خراب ہے آبادی اول تو بڑھی نہیں اور جو بڑھی سو حفظانِ صحت سے محروم سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ تمہارے میاں کی جاگیر میں جو غیر آباد رقبہ ہے اس میں نوپاشی کا کوئی انتظام نہیں۔ نو آبادی کا محکمہ قائم ہوا۔ مگر نہ ہونے کے برابر تمہارے میاں پر بالخصوص کچھ اور الزام بھی ہیں کہ سہاری مال کا حساب نہیں ملتا۔

زمین :- اماں، بالکل جھوٹ۔ چاہے مجھ سے وہ کیسا ہی سلوک کریں۔ لیکن یہ تو میں ضرور کہوں گی کہ اجڑ ہوں تو ہوں فریسی مطلقاً نہیں۔ حساب نہیں ملتا تو ان کے منشی کی غلطی ہوگی۔ لوجی اب رئیس زادے حساب رکھنے بیٹھیں۔

کہکشاں :- بس یہی اصلاح ہے کہ چاہے کوئی رئیس زادہ ہو یا معمولی باشندہ ہر کوئی اپنی آمدنی کے خرچ کا حساب رکھے اور آمدنی کا جائز حصہ ذاتی مصارف کے لئے محفوظ رکھ کر باقی جمہور کی خدمت کے لئے وقف کرے۔ یہ پہلا اصول ہے۔

زمین :- اصلاح و صلاح کیا۔ یہ تو اچھی خاصی ٹوٹ ہوئی۔ ریاست کا سہ کی رہ گئی۔ نوکری سے بدتر درجہ ہوا۔

کہکشاں :- ہاں بیٹی اسی سے میں حیران پھرتی ہوں، تمہارے ابا کا حکم ہے کہ کئی سو لونڈیاں کم کر دوں۔ اتنے ہی نوکر کم کریں گے یہ سب تمہارے پچھواڑے کی طرف بسائے جائیں گے مگر محکوم حیثیت سے نہیں بلکہ پوری آزادی سے۔

زمین :- پوری آزادی نہ خاک وھول۔ لوجی اب ہمارے گھر کی لونڈیاں بانڈیاں ہمارے برابر ہیگمات بن کر رہیں گی میاں سے کہہ کر جوتیوں سے نہ پڑاؤں تب سہی۔

کہکشاں :- یہی تمہاری خام خیالی ہے۔ میاں تمہارے کیا کریں گے۔ بچا رہے آئے دن بڑی سرکار کے انسپکٹر۔ محاسب فوجی افسروں کا دورہ ہوگا۔ انتظام انکا حکم انکا سرایہ انکا تمہیں تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔

زمین :- بھوٹی قسمت۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ تم سے لونڈیاں بانڈیاں لوں گی۔ میاں سے کہوں گی کہ اپنے یہودی سے قرض لیں اور اس رقم سے اپنے بیٹے کو الگ گزارے کے لئے کچھ جگہ بنا دیں۔ یہاں تو چلنے پھرنے کی بھی دقت ہے۔ وہی

ایک جانب اس قابل تھی کہ اس میں دو ٹھیکرے بن جاتے سو وہ بھی ہاتھ سے جاتی نظر آتی ہے۔ اس پاگل کا اور تمہیں گزارہ نہیں ہوگا۔ سوچتی تھی کہ اپنی نگاہ تلے اسے بساؤں۔ اس کا بھی گھر بنے، خیر نصیب۔

کہکشاں :- بیٹی مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے آبا بڑے صاحبِ تدبیر ہیں۔ دیکھو تو سہی کچھ نہ کچھ کریں گے۔ اچھا ہوا جو تم نے مجھ سے کچھ ذکر کر دیا۔ میں ان سے کہہ دوں گی کہ نواسے کے لئے کچھ بندوبست کر رکھیں۔ لو اب خدا حافظ (منہ چوم کر)

میری اچھی بیٹی خواہ مخواہ دل برا نہیں کرنا چاہئے۔

زمین :- اماں ذرا تو ٹھہرو۔

کہکشاں :- نہ بیٹی اب تو جاؤں گی۔ گھر کے سودھندے ہیں۔

زمین :- ایلو ذرا تو سستاؤ۔ ہاں اب کے کوئی رت جگا ہو تو مجھے ضرور بلوانا۔ میں کیا اس موئے کی لونڈی ہوں

کہ گھر سے قدم نہ نکالوں۔ ایسا جی چاہتا ہے کہ تمہارے صحن میں ناچیں کو دیں گائیں۔

کہکشاں :- ضرور بلواؤں گی اور سورج کی کیا مجال کہ تمہیں روکے۔ مگر یا تو تم اس جوں والے معاملے کو چھپاؤ یا جب بالکل دور ہو جائیں تب آؤ کیونکہ کئی سال سے کوانٹم میٹھی ہے جس کے سر میں اس قسم کی جوں ہوا سے ناچ میں نہیں آنے دیتے۔ یہ خبیث ایک سے دوسرے کو جھٹ چڑھ جاتی ہے۔

زمین :- بیوی تم جوں کا خیال نہ کرو۔ اُسے تو میں ایک ہی دن میں مار دوں گی۔ تم بلوانا ضرور اور ہاں تم میرے لئے کیا لائی ہو؟

کہکشاں :- (انتہائے محبت سے) پٹرل تیری مانگنے کی عادت نہ گئی۔ خیر کا وقت آنے دے۔ سب کچھ لاؤنگی (چلی جاتی ہے) زمین :- بیوی آداب۔

سورج :- (ایک ننھے سورج کو دور سے دیکھ کر) کہئے چھوٹے صاحب تم یہاں کہاں؟
ننھا سورج :- آداب بھائی صاحب۔ کالج میں چھٹیاں تھیں آزادی از کشتش کا پاس مل گیا تھا۔ چنانچہ فضا کے عالم کی اپنی مرضی سے سیر کرتا پھرتا ہوں۔ کچھ دیکھ لوں گا۔ کچھ تجربہ کرے گا۔ کالج کی انجمن مباحثہ میں بیو اس کے لئے مصالحوں باتھ لگ جائیگا سورج :- کالج کیسا؟

ننھا سورج :- انجینئرنگ کالج۔
سورج :- لا حول ولاقوة۔ تو کیا اب تمہارے یہاں نوبت با اینجا رسید کہ رئیس زادوں کو بھی لوہار، بڑھئی کے کام کی تعلیم دیا جاتی ہے۔

ننھا سورج :- (ہنس کر) جی ہاں! ہمارے یہاں تو کچھ اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ شریف زادوں کو شک کا فائدہ اٹھانے دیا جائے اور اس شک کی بنیاد پر فی الحال انھیں ذمہ داری روح کی فہرست سے خارج نہ کیا جائے۔
سورج :- (دل میں سخت پیچ رہتا ہے) بھائی اس نئی تعلیم کا نتیجہ؟

ننھا سورج :- (کالج کی آزاد ہوا میں پلا ہوا نوجوان کچھ شوخی سے جواب دینے پر آمادہ تھا مگر یہ سوچ کر کہ دور نزدیک کی قربت داری ہے۔ مخاطب ایک طرح سے بہنوئی بھی ہے رک کر متانت سے جواب دیتا ہے) بھائی صاحب آپ تو کبھی دہر آتے نہیں ورنہ نتیجہ خود دیکھ لیں۔ لڑکے اور لڑکیاں اچھے تعلیم پاتے ہیں پہلا سا حجاب نہیں۔ سچ پوچھئے تو پہلی سی جہالت نہیں۔ پچھلے سال صرف ہمارے صوبے کے نوجوان سورج کانفرنس میں جمع ہوئے۔ تجویز ہوئی کہ موجودہ نظام میں روشنی کشتش دونوں کا بجٹ بن کر جمہور کی رائے کے مطابق ان ذرائع کی تقسیم ہوسکتا ہوں کہ صدر اعلیٰ میں اس تجویز کو پسند کیا گیا ہے اور جلدی احکام جاری ہونے والے ہیں کہ یہ سہاروں لاکھوں سورج جو شہر بے مہار کی طرح چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ آئندہ مقررہ خدمات پر مامور کئے جائیں۔ لاکھوں سورج خود ہی

رپورٹ کر چکے ہیں کہ انھیں اپنے سابقہ اختیارات کی ترمیم میں کوئی عذر نہیں۔ بلکہ تجویز یہ بھی ہے کہ کوئی سورج بھی بالطبع محرک نہ رہے جس کا نتیجہ حکمائے ارتقاء کی رائے میں نہایت حسن افروز ہوگا اس صدیوں کی پرانی گول گنبد والی ہیئت کذائی میں بوجہ سکون قدرتی طور پر تبدیلی ہوگی اور آئندہ سورج نہایت خوشنما ہزار پہلو قطع کے ہوں گے۔ آپ مفصلات کے بزرگوار اگر کچھ دیکھ سکیں، تو ممکن ہے اور بھی بہتر تجاویز نکلیں۔ جواہل الرائے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا ہے کہ پرانے نظام کے تحت بعض سورج اپنی آزادی کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خاندانی زندگی میں بجائے باہمی امداد کے ایک تحکم کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ سچ پوچھئے تو اس زمرہ میں آپ کا بھی ذکر ہوا تھا مگر سرسری طور پر۔

سورج :- ڈیم۔ میرا کیا ذکر ہوا تھا؟

ننھا سورج :- اجی جانے دیجئے فرمائیے ہماری آیا تو اچھی ہیں؟

سورج :- اچھی ہیں مگر مجھے یہ ضرور بتاؤ کہ میرا کیا ذکر ہوا تھا؟

ننھا سورج :- بھائی صاحب! میں نے صرف اسی قدر سنا کہ آپ بڑے دقتیانوسی خیالات رکھتے ہیں تعلیم کے خلاف ہیں اور ابھی تک اپنے بچوں کے لئے تعلیم کا مناسب انتظام نہیں کیا۔ کوئی کہتا تھا کہ آپ کے چار بچے ہیں، کوئی کہتا تھا پانچ ہیں، آخر ان میں کوئی نہ کوئی اس عمر کا ہوگا کہ اسے کلج نہ سہی اسکول کی بڑی جماعتوں میں داخل کرایا جائے۔ خدا جانے آپ نے کیوں ایسا نہیں کیا۔

سورج :- سچ پوچھو تو میں تعلیم کا مخالف ہوں۔ ہمارے باپ دادا نہیں پڑھے تو گزرا ہو ہی گیا۔ میں بھی صرف کہ :۔ ہی میں پڑھا اور میرے خیال میں وہ بہت کافی ہے۔ دوم میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ تعلیم کے مصارف برداشت کروں۔ چار بیویاں، عیال داری، جہانداری خدا جانے کس تنگی ترشی سے گزرتی ہے۔ تم سے تو کوئی پردہ نہیں۔ اب صرف نام کی جاگیر داری ہے۔

ننھا سورج :- بھائی صاحب آپ اپنا کورٹ آف وارڈز کرائیے۔ وہ خود ہی بچوں کی تعلیم کی فکر بھی کر لیں گے اور آپ بھی ذرا پریشان رہیں گے۔ آداب (جاتے جاتے) آپا کو تسلیم۔

از فلک پیمیا

(منادی)

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے فلسفہ مذہب تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت ۷۰ روپے ۱۲۰ روپے وصول علاوہ۔

نگار بک اینڈ پرنٹنگ

باب الاستفسار

آتش فرود

(جناب سید محمد صالح صاحب - مراد آباد)

حضرت ابراہیم کے اس واقعہ کے متعلق کہ فرود نے انھیں آگ میں پھینک دیا اور آگ نے کوئی اثر نہ کیا، آپ کا کیا خیال ہے۔ کلام مجید میں اس واقعہ کا بیان ہونا اس کا ثبوت ہے کہ یہ واقعہ سچا ہے کیونکہ یہ الہام خداوندی ہے اور الہام غلط نہیں ہو سکتا۔

(نگار) آپ نے یہ سوال اگر اس قدر سادگی سے نہ کیا ہوتا تو شاید میں جواب نہ دیتا، لیکن آپ کی معصومیت نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں جلد سے جلد آپ کو اپنی رائے سے مطلع کر دوں، خواہ وہ آپ کی توقع کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کے اس استفسار نے بحث کے تین پہلو پیش کر دیے ہیں۔ ایک یہ کہ کلام مجید الہام خداوندی ہی یا نہیں، دوسرے یہ کہ قرآن میں اس واقعہ کا پایا جانا اس کی صداقت کا ثبوت ہو سکتا ہے یا نہیں اور تیسرے یہ کہ نفس واقعہ کی تاریخی یا علمی حیثیت کیا ہے۔

کلام مجید کو میں نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں نہ الہام ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں، اور اس مسئلہ پر میں اس سے قبل کئی بار مفصل گفتگو کر چکا ہوں، کلام کا مفہوم اس وقت تک متعین نہیں ہو سکتا جب تک "نطق" اس سے متعلق نہ ہو اور "نطق" نام ہے مخصوص عضلات کی حرکت کا اس لئے اگر ہم خدا سے کسی کلام کو منسوب کریں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے لئے "نطق" بھی لازم ہوگا جس کا تعلق یکسر مادیات سے ہے۔ علاوہ اس کے الہام خداوندی کو کسی ایک یا ایک سے زائد مخصوص زبانوں میں محدود کر دینا، خدا کی صفت کو محدود کر دینا ہے اور چونکہ صفات ربانی عین ذات ربانی ہیں اس لئے اس طرح گویا خدا کو محدود کر دینا ہوگا جو عقیدہ اسلام کے بالکل منافی ہے۔

اسی کے ساتھ ایک اعتراض یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ کیا خدا صرف عربی و عبرانی زبانوں میں نطق کر سکتا تھا اور دوسری زبانوں میں نہیں۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ وہ تمام زبانیں جانتا ہے تو مناسب یہ تھا کہ مختلف قوموں کی مختلف زبانوں میں وہ وحی بھیجتا تاکہ ان کو سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ صرف اہل عرب کی زبان میں اپنا کلام نازل کرنا اور تمام دنیا کے انسانوں کو مجبور کرنا کہ اسے سمجھیں اور کلام ربانی قرار دیں کسی طرح قرین انصاف قرار نہیں دیا جاسکتا یہ بات مسلم ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں انسان ہی کی بنائی ہوئی ہیں جو پہلے صرف اشارات یا اشارتی صوت صداد کی صورت رکھتی تھیں اور بعد کو آہستہ آہستہ ترقی کر کے جذبات کے اظہار کا ذریعہ قرار پائیں۔ اس لئے بجائے اسکے کہ ہم خدا کو تمام زبانوں کا فرہنگ قرار دیں، یہ کیوں نہ کہیں کہ خدا نے انسان میں یہ قدرت و ولایت کر دی تھی کہ وہ خود جذبات کے اظہار کے لئے زبان وضع کرے اور اس طرح گویا فی المعنی وہی زبانوں کا بھی پیدا کرنے والا ہے۔

اس صورت میں الہام یا وحی سے مراد صرف وہ تاثرات ہوں گے جو ایک انسان یا رسول کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اور جنہیں وہ مروجہ زبان میں نہایت کامیابی و خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر دیتا ہے۔ اس امر کا ثبوت کہ وحی کا تعلق کسی مخصوص زبان سے نہیں ہے، خود کلام مجید میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:- ”تم اوحی ربکم الی النحل“ ظاہر ہے کہ شہد کی مکھی پر عربی یا عبرانی میں تو وحی نازل ہوئی نہ ہوگی بلکہ اس سے مراد مکھی کی وہ فہم و دکاوت ہوگی جسکے زیر اثر وہ پھولوں کا رس جا کر چوستی ہو کلام مجید کو بھی ”وحی“ کہتے ہیں اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ اسکو بھی رسول کی فہم و فراست سے تعبیر نہ کیا جائے اور خواہ مخواہ الفاظ یا کلمات سے متعلق سمجھا جائے جن کا تعلق مادی دنیا سے ہو۔ بہر حال میں قرآن کی کسی حکایت کو محض اس بناء پر کہ اسے الہام خداوندی سمجھا جاتا ہے، صحیح باور نہیں کر سکتا کیونکہ الہام کا تعلق الفاظ سے مطلق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ میں رسول اللہ کو بڑے بلند اخلاق کا انسان سمجھتا ہوں، اور یقین رکھتا ہوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے تھے، اس لئے قرآن میں واقعہ ابراہیم کا پایا جانا اس امر کی دلیل تو ضرور ہے کہ رسول اللہ نے اسے جھوٹ بیان نہیں کیا، یعنی اپنی طرف سے گھڑ کے بیان نہیں کیا لیکن اسکا اثر نفس واقعہ کی صحت یا عدم صحت پر بالکل نہیں پڑتا۔

کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جاسکتا ہے، عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں توریت و انجیل کے حوالہ سے لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کے لئے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چونکہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا، اس لئے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لئے بیان کر دیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کی کہ وہ صحیح ہیں یا غلط۔

اس طرح کی حکایتیں دنیا کے تمام مذاہب بلکہ مذاہب کے وجود سے قبل انسان کے عہد وحشت میں بھی

جہل و کم علمی کی وجہ سے رواج پانچکی تھیں جن کو قرآن نے بھی ”اساطیر الاولین“ یا اصدنامی روایتوں سے تعبیر کیا ہے۔ اب آپ ”آتش نمرود“ کے واقعہ کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ کلام مجید میں بھی تقریباً وہی بیان کیا گیا ہے جو یہودیوں کی کتاب (Mirdash Rabbah) میں پایا جاتا ہے۔ پہلے آپ اسلامی روایت مختصراً سن لیجئے:-

”ابراہیم کی پردریش ایک غار میں ہوئی تھی اور انھیں سچے خدا کا کوئی علم نہ تھا، پہلے انھوں نے چکے تاروں کو خدا سمجھا، پھر چاند کو اور اس کے بعد آفتاب کو لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ سب ڈوب جاتے ہیں تو وہ اس شرک سے منہ موڑ کر خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔

ان کے باپ آذر بت تراش تھے اور بت بنانا کراہیم کو دیا کرتے تھے کہ بازار جا کر انھیں بیچ لائیں، لیکن چونکہ وہ بت پرستی چھوڑ چکے تھے اس لئے نہ وہ ان کو فروخت کر سکتے تھے نہ ان کے منہ سے بتوں کی برائیاں سن سن کر انے کوئی خریدتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم ان کی طرف مایل ہو چلی اور انھوں نے اپنے باپ آذر کو بھی اپنا دین قبول کرنے کی دعوت دی:- ”یا اہت لم تعبد الا لسمع ولا یبصر ولا یغنی عنک شیئاً“ (اے باپ تم کیوں اسکی پرستش کرتے ہو جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے نہ تمھارے کسی کام آسکتا ہے)۔

آذر نے ابراہیم کی اس دلیل کو ماننے سے انکار کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ بات غروہ کے کانوں تک پہنچی۔ غروہ نے ابراہیم کو بلا کر پوچھا کہ ”تیرا خدا کیا ہے“ انھوں نے جواب دیا کہ ”میرا خدا وہ ہے جو زندہ رکھتا ہو اور مار ڈالتا ہو“ غروہ نے کہا یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ واجب القتل لوگوں میں سے جس کو چاہوں مار ڈالوں اور جس کو چاہوں نہ ماروں۔ یہ سن کر ابراہیم نے کہا کہ ”میرا خدا آفتاب کو مشرق کی طرف سے نکالتا ہے تو اُسے مغرب کی طرف سے طلوع کر کے دکھلا“ (کہا جاتا ہے کہ یہ جواب سن کر غروہ دگھبرا گیا، حالانکہ اگر وہ بھی اُلٹ کر یہی کہہ دیتا کہ میں آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہوں، تو اپنے خدا سے کہہ کہ وہ مغرب سے نکالے، تو شاید ابراہیم کے پاس کوئی جواب نہ رہ جاتا)۔

ابراہیم کی قوم ہر سال ایک عظیم الشان تہوار منایا کرتی تھی جس میں کھانے طیار کر کے لوگ شہر سے باہر لیجاتے اور بتوں کے سامنے رکھ دیتے۔ ابراہیم نے بتوں کے سامنے کھانا رکھا ہوا دیکھ کر ان سے طنزاً کہا ”کیا تم نہیں کھاؤ اور پھر ان بتوں کو توڑ کر کھا بیٹھی بڑے بت کے شانہ یا گردن میں لٹکا دی جس سے یہ ظاہر ہو کہ اسی بت نے دوسرے چھوٹے بتوں کو توڑا ہے۔

اس واقعہ پر بڑا ہنگامہ برپا ہوا اور آخر کار جب ابراہیم سے سوال و جواب میں لوگ نہ جیتے تو لوگوں نے اُن کو آگ میں ڈال کر جلا دینے کا مطالبہ کیا۔ میں اس جگہ ان روایات کو نظر انداز کرتا ہوں جو آگ کی طیاری کے سلسلہ میں بیان کی جاتی ہیں اور جن کا تعلق قرآن کے بیان کردہ واقعات سے نہیں ہے۔ الغرض ابراہیم آگ میں ڈال دئے گئے لیکن خدا نے آگ کو حکم دیا کہ ”کوئی بردا و سلاماً علی ابراہیم“ (ابراہیم کے لئے تو

ٹھنڈک اور سلامتی میں تبدیل ہو جا) اور اس طرح حضرت ابراہیم بچ گئے، کہا جاتا ہے کہ اگر خدا صرف بردا کہہ کر خاموش ہو جاتا اور سلا نا کا حکم نہ دیتا تو وہ آگ اتنی سرد ہو جاتی کہ ابراہیم بجائے آگ کی گرمی کے اسکی سردی سے فنا ہو جاتے۔ یہ ہے خلاصہ اسلامی روایت کا۔

اب یہودیوں کی کتاب مرداشس ربا کے بیان کو سنئے :-

تیراہ، یا زیراہ (Jerah) ایک بُت ساز تھا، ایک بار وہ کہیں باہر گیا اور دوکان پر ابراہیم کو بٹھا گیا۔ جب کوئی شخص بُت خریدنے آتا تو ابراہیم اس سے پوچھتے "تیری عمر کیا ہے" وہ شخص کہتا "پچاس یا ساٹھ سال" ابراہیم کہتے "افسوس ہے کہ تیری عمر پچاس ساٹھ سال کی ہو گئی اور تو ایسی چیز کو پرستش کرتا ہے جو ابھی بنائی گئی ہے"۔ ایک مرتبہ کوئی عورت آئی جس کے ہاتھ میں آٹے کی تھالی تھی۔ اس نے ابراہیم سے کہا "یہ لو اور بتوں کے آگے رکھ دو" وہ اُٹھے اور ڈنڈا لیکر سب بتوں کو توڑ دیا اور پھر ڈنڈا بڑے بُت کے ہاتھ میں دیا۔ جب ان کا باپ واپس آیا اور یہ حال دیکھا تو ابراہیم نے کہا کہ "بڑے بُت نے چھوٹے بتوں کو توڑ ڈالا ہے"۔ یہ سنکر تیراہ ابراہیم کو غرود کے پاس لے گئے۔ غرود نے ابراہیم سے کہا "آؤ آگ کی پرستش کریں" ابراہیم نے جواب دیا "پانی کی پوجا کیوں نہ کریں، جو آگ کو بجھا دیتی ہے"۔ غرود نے کہا "اچھا آؤ پانی ہی کی پرستش کریں" اس پر ابراہیم نے کہا "اگر ایسا ہی ہے تو پھر بادل کی پوجا کیوں نہ کریں جس سے پانی برستا ہے"۔ غرود نے کہا "اچھا آؤ بادل ہی کی پرستش کریں"۔ ابراہیم نے جواب دیا کہ "اگر ایسا ہی ہے تو پھر ہوا کی پوجا کیوں نہ کریں جو بادلوں کو ہنکاتی پھرتی ہے"۔ غرود نے کہا "اچھا آؤ ہوا ہی کی پوجا کریں"۔ اس پر ابراہیم نے کہا کہ "پھر انسان ہی کی پوجا کیوں نہ کریں جو ہوا کو روک لیتا ہے"۔

یہ سنکر غرود بگڑ گیا اور بولا "بس، خاموش رہ، میں کسی چیز کی پرستش نہیں کرتا، صرف آگ کو پوجتا ہوں دیکھ میں تجھے آگ میں ڈالے دیتا ہوں، دیکھوں تیرا خدا تجھے کیونکر بچا تا ہے"۔ چنانچہ ابراہیم کو غرود نے آگ میں ڈلوادیا لیکن آگ نے انھیں نہ جلایا۔

"مرداشس ربا" کی اس روایت اور روایت اسلامی کا پس منظر بالکل ایک ہے اور تھوڑا سا اختلاف جو تفصیل جزئیات میں پایا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جس طرح ہر زمانہ میں ایک ہی روایت مختلف طریقوں سے بیان کی جاتی ہے، اسی طرح یہ روایت بھی رسول اللہ کے زمانہ میں کچھ اختلافات کے ساتھ بیان کی جاتی ہوگی اور رسول اللہ نے اس بیان کو زیادہ قرین قیاس و مناسب سمجھا جو کلام مجید میں پایا جاتا ہے۔

قرآن میں ابراہیم کے باپ کا نام آذر بتایا گیا ہے اور مرداشس ربا کی روایت میں تیراہ ہے۔ لیکن چونکہ بعض یہودی بجائے تیراہ کے زیراہ (Zarah) بھی کہتے تھے اس لئے ہو سکتا ہے آذر اسی کی

بگڑی ہوئی صورت ہو۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہ واقعہ صرف یہودی روایتوں سے لیا گیا ہے، جس کی تصدیق توریت ناموں میں ہوئی ہے بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ توریت کی کتاب پیدائش سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نروڈ ابراہیم سے صدیوں پہلے پایا جاتا تھا۔ بعض محققین کا بیان ہے کہ اس قصہ کی ساری بنیاد ایک یہودی کی جاہلانہ غلطی ہے۔ اس یہودی کا نام جو ناخون تھا اس کی تفصیل سننے کے قابل ہے۔ توریت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابراہیم پہلے کالڈیا میں رہتے تھے اور پھر خدا نے انہیں کنعان میں جا کر رہنے کا حکم دیا۔ اس کو توریت میں اس طرح بیان کیا ہے: ”میں وہ خدا ہوں جس نے تجھے کالڈیا کے اور سے باہر نکالا“

اور قدیم بابلی زبان میں شہر کو کہتے تھے جیسے اور شلم بمعنی ”دارالسلام“ لیکن اسی لفظ کے معنی ارامی زبان میں آگ کے ہیں۔ چونکہ یہ یہودی بابلی زبان نہ جانتا تھا اس لئے اور کے معنی ”آگ“ سمجھ کر، توریت کی اس آیت کا مفہوم اس نے یہ بیان کیا کہ ”میں وہ خدا ہوں جس نے تجھے کالڈیا کی آگ سے باہر نکالا“ اور اس طرح ایک یہودی کی غلطی سے ابراہیم کے آگ سے نکلے جانے کی روایت وجود میں آئی جس میں بعد کو لوگوں نے زیب داستان کے لئے وہ سب کچھ اضافہ کر لیا جو مرداش ربا اور کلام مجید کی روایت میں پایا جاتا ہے۔

میں آخر میں پھر عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ قرآن میں جتنے قصے بیان کئے گئے ہیں ان کو تاریخی حقیقت و صداقت کی حیثیت سے بیان نہیں کیا گیا بلکہ صرف اعتبار و بصیرت کے لئے بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ان حکایات و قصص سے اس کے الہامی یا غیر الہامی ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :- از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲ روپیہ جنس :- دیہی جس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہو از جی۔ سی کمار پاتنا صاحب۔ قیمت ۲

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ) اس مختصر پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور ان کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴

منہج نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

نیاز نوازا ، میں آپ کے پاس سے لوٹ تو آیا، لیکن یہ نہ پوچھئے کہ کس عالم میں لوٹا
جو تری ہزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دل وہیں ، دماغ وہیں — اور اگر دین و ایمان میرے پاس تھا تو یہ بھی وہیں کا ہو کر رہ گیا ! سچ تو یہ ہے کہ آپ کو
مار رکھنے کے اتنے ڈھب معلوم ہیں کہ اُن سے جان بچا کر نکل آنا میں کیا رستم و اسفندیار کے بس میں بھی نہیں
مجھے وہ سب کچھ یاد ہے جو چلتے وقت آپ نے کہا تھا اور اگر وقت و ہمت نے یاری دی تو آپ کی ہتائی ہوئی راہ
پر چلنے کی کوشش کروں گا، لیکن جس چیز کو آپ کامیابی کہتے ہیں وہ میرے نزدیک بدترین ناکامی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ
فی الحال چند روز اپنے آپ کو دھوکا دے سکوں، لیکن یہ زمانہ بھی اس احساس سے خالی نہ ہوگا کہ میں اپنے آپ کو
فریب دے رہا ہوں، اس لئے سکون معلوم ! بہر حال آپ مطمئن رہئے، میں آپ کو مایوس نہیں کہوں گا۔ جذبات
کے لئے جذبات ہی کی قربانی ہونی چاہئے۔ میں اس کو خوب سمجھتا ہوں

جی ہاں ، تشریف لائے تھے، لیکن

پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے

تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے، گفتگو میں تلخی شروع ہونے سے پہلے ہی — میں نے روکنا مناسب نہ سمجھا، کہہ تو گئے
ہیں کہ پھر آئیں گے، لیکن امید کم ہے، میری تحریر سے تو نہیں، لیکن آپ کی تحریر سے ضرور وہ چوکنہ ہو گئے ہوں گے، اور
دوبارہ گفتگو کا موقعہ مشکل ہی سے دیں گے۔ بہر حال وہ نہ آئے تو میں جاؤں گا، اور کم از کم یہ تو پوچھ ہی لوں گا کہ
اس فساد کا سررشتہ کس کے ہاتھ میں ہے۔

انجم صاحب - آپ جس محبت سے مجھے بلاتے ہیں اور میں جس بدتمیزی سے آپ کو مایوس کر دیتا ہوں اسکی
سزا مجھے عاقبت میں ملے یا نہ ملے لیکن آپ کو اگر اس کی جزا نہ ملی تو سچ کہتا ہوں کہ جنت میں جانے سے انکار کر دوں گا۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ اس معاملہ کو آپ خدا پر چھوڑ دیں۔ کچھ نہ پوچھتے کہ آپ کبھی کبھی یاد فرما کر کیسی خلش دلا میں پیدا کر دیتے ہیں، اور ہر بار احساسِ نارسائی مجھے کفر کی حد سے کس قدر قریب کر دیتا ہے۔

کیا پوچھتے ہیں آپ کس عالم میں ہوں۔ آپ کو ضد ہے کہ اُسی موسم میں میرا حال پوچھیں گے جب مجھے خود اپنی ذات سے بھی نفرت ہو جاتی ہے اور نیننی تال کی چوٹی ہی پر بیٹھ کر پوچھیں گے۔ آپ کو بھی گالیاں سننے میں مزہ آتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ خدا اگر بغیر سورج کے کرۂ زمین کو پیدا نہیں کر سکتا تھا تو کیا یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ خطِ استوا سے دور کسی مقام پر مجھے پیدا کرتا

یہ ظالم آفتاب، یہ پاچی آفتاب! اُن صبح کو جب اس کی کرنیں دماغ میں جا کر چبھتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا احساسِ انسانی کو گرم سلاخوں سے پھیدا جا رہا ہے۔ میں آنے کو تو آ جاؤں لیکن ان تمام جھگڑوں کو کس کے سر ڈال جاؤں، جن پر بہر حال زندگی کا مدار ہے۔

خدا کے لئے جب تک آپ وہاں رہیں میرا حال نہ پوچھا کیجئے مجھے سخت غصہ آتا ہے، معلوم نہیں زبان سے کیا نکل جائے اور آپ کو بُرا لگے

محترمہ - مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ کی زندگی کا وہ دور ختم ہو گیا، جس کی آزادی سے لطف اٹھانے کے لئے آپ طیارہ تھیں

حقیقت یہ ہے کہ عورت کی مجبوری و پابندی کبھی بجائے خود بڑی پُر لطف چیز ہے اگر تہذیب و تمدن کی پریشاں خیالیاں اس کے سکون کو تباہ نہ کریں

یقیناً آپ کے رفیقِ زندگی آپ سے خوش ہوں گے اور دنیا میں وہ کون ایسا ہے جو آپ کو شریکِ حیات بنا کر مسرور و شاد کام نہ ہو۔ آپ کے منفعلانہ انداز کی جسارتیں بڑے بڑوں کو رام کر سکتی ہیں چہ جائیکہ ایک غریب ڈاکٹر جس کی دنیا اعصاب و عضلات سے آگے کبھی نہیں بڑھی

گاہ گاہ یاد فرماتی رہئے۔ زندگی کے وہ چند دن جن میں کبھی کبھی آپ کی فجل تبسم فروشوں سے خاموش لطف اٹھایا کرتا تھا، میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ آپ کی بچی کہاں ہے۔ وہیں علی گڑھ میں یا آپ کے پاس؟

خط کے جواب میں

سلام!

تمہیں حرم کی فضا میں سلام کہتی ہیں
 بہارِ حسنِ عقیدت کے بھیجتی ہے پھول،
 دبی زبان سے کلیوں کے لب پہ "آداب"
 درِ قبول سے ٹھکرا دیا گیا جن کو
 صنم کردوں کی ہوائیں سلام کہتی ہیں
 چمن کی مست گھٹائیں سلام کہتی ہیں
 گلوں کی تنگ قبائیں سلام کہتی ہیں
 وہ بد نصیب دُعا میں سلام کہتی ہیں
 جو ہیں تصورِ سود و زیاں سے بے پروا

وہ بے نیاز وفا میں سلام کہتی ہیں
 تمہاری بزم میں بھی جو سکون پانے سکیں،
 جو رہ گئی تھیں تمہاری طرف ذرا اٹھ کر
 جو ہو سکے تو اسی طرح مُکرا دینا
 وہ بے قرار نگاہیں سلام کہتی ہیں
 بعدِ نیاز وہ باہیں سلام کہتی ہیں،
 کسی غریب کی آغوش سلام کہتی ہیں

پیام!

جھے یہ ڈر ہے کہیں راز آشکار نہ ہو
 خدا بچائے جدائی کی سخت گھڑیوں سے
 زمانہ توہ میں رہتا ہے ایسی باتوں کی،
 ترے جواب کو پڑھ کر ضمیر کانپ اٹھا
 خدا کے واسطے اس درجہ بے قرار نہ ہو
 تری طرح کوئی مجبور انتظار نہ ہو
 خدا کرے کہ ترا کوئی راز دار نہ ہو
 ملول، ہجر بن، اور اشکبار نہ ہو
 جسے سنا تھا کسی نشر گاہ سے تو نے
 مرے دُکھے ہوئے دل کی کہیں چکار نہ ہو

محبت ایک مقدس خلش ہے فطرت کی،
 دکھا کے عشق کی پاکیزگی کا اک منظر
 اسی خلش سے نہ کیوں ابتلائے کار کریں
 ہوس پرست زمانہ کو شرمسار کریں
 خزاں بھی آئے تو نظارہ بہار کریں
 رہیں شگفتہ ہماری مسرتوں کے پھول
 نگاہ جس طرح پھولوں کو چوم لیتی ہے
 اسی طرح سے ہم اک دوسرے کو پیار کریں
 ماہر القادری

کسان

اعتبارِ وقت سے لیکر خراجِ زندگی
زندگی آئی جہاں میں محفلیں قائم ہوئیں
پھر تمدن کو نظامِ دائمی بخشا گیا
زندگی کی مختلف راہیں بنا دینے کے بعد
زندگی پر چھا گیا آخر غبارِ زندگی
لیکے اک ہلکی سی انگڑائی سبکداری کے ساتھ
اک کسان آگے بڑھا وہم تمدن چھوڑ کر
رکم لیا چپ چاپ اُس نے بارہتی دوش پر
وہ امینِ رازِ فطرت، شاد کامِ زندگی
مردِ میدانِ عمل، پروردگارِ زندگی،
روح کی معصومیت کا شاہکار اولیں
ضامنِ امنِ دو عالم، رہنمائے زندگی
یوسفِ ہستی، کلیمِ دل، خلیلِ زندگی
جنشِ دل کا پیمبر، سادگی کا دیوتا
بے نیازِ دولت کو نین رہتا ہے کسان
اس کے دم سے کجکلاہوں کی کلاہِ افتخار
دور رہتا ہے زمانے کی ہوسکاری سے دور
چھیڑ کر بیتابیوں سے نرم سازِ زندگی
جان دیدیتا ہے ہستی کی حمایت کے لئے

ابنِ آدم نے سنبھالا تخت و تاجِ زندگی
انتہائے غور سے کچھ منزلیں قائم ہوئیں
نقشہ افکارِ ہستی غور سے کھینچا گیا،
ہر نقابِ صورتِ ہستی اٹھا دینے کے بعد
غور سے سوچا "اٹھائے کون بارِ زندگی!"
انتہائے تکنت سے، زعمِ خودداری کے ساتھ
اعتبارِ پیش و پس کی ساری کڑیاں توڑ کر
آگیا بحرِ جمالِ زندگی جو شش پر،
ناظمِ نظارہائے صبح و شامِ زندگی
رہبرِ انسانیت، سجدہ گزارِ زندگی
عظمتِ انسانیت کا پاسدارِ اولیں،
زندگی کے واسطے رہن بلائے زندگی،
تاسمِ مینا نہائے سلسبیلِ زندگی
موت کی تارِ کیوں میں زندگی کا ہمنوا،
دوسروں کے واسطے بے چین رہتا ہے کسان
اخذ کر لیتی ہے میدانِ سیاست میں وقار
اور اس دنیا کی ہر رنگین مکاری سے دُور
برق کے سائے میں پڑھتا ہے نمازِ زندگی،
مٹ کے رہ جاتا ہے دنیا کی مسرت کے لئے

کار فرمائے عمل ہے غم سے گھبراتا نہیں
مسکراتا ہے مصیبت پر مصیبت جھیل کر
اس کو سب انسان کی چالاکیاں معلوم ہیں
حسن کی سرگرمیاں محسوس کر لیتا ہے یہ
ہاں اسے دنیا کے دوں کی ہر کمی محسوس ہے
نغمہ پوشیدہ ہر ساز سن لیتا ہے یہ
یہ لطافت آشنائے نبضِ دوراں بھی تو ہے
پھر بھی اپنی زندگی سے بے خبر رہتا ہے یہ
ظلم کا بار اٹھایا ہوا، دنیا کا ٹھکرایا ہوا
بے حیا دنیا کے ہر دھوکے میں آجاتا ہے یہ
دھمکیاں دیتا ہے اس کو آسمان کینہ خو
کیوں لعینو! تم نے ڈالی ہے نظر انجام پر
حرص کے دیوا بنو! اس دنیا کی رنگیں شام میں
ظالمو! دنیا میں اکدن انقلاب آجائے گا
اسکی فطرت میں نہاں ہیں سیکڑوں بیاباں
اسکی رگ رگ میں بھری ہیں برق کی میناں

اسے زمین کے رہنے والو! تم کو ڈرنا چاہئے!

اور اس کے درد کا احساس کرنا چاہئے!

شمیم نعمانی نیازی

تقریباً ہر ماہ

آپ حضرات کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جاتی ہے کہ ہر چہ نہ پہونچنے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ اُسی ماہ کے اخیر
تک دفتر میں آجانی چاہئے ورنہ ڈاکخانہ کے جدید قانون کے زیر اثر ہم پچھلے ماہ کے پرچہ پر اس کے ٹکٹ لگا کر بھیجنے پر مجبور
نہ ہونگے۔ بعض حضرات بزرگ طلب کر کے واپس کر دیتے ہیں۔ آئندہ ایسے کسی خط کی تعمیل نہ ہوگی، اگر اس کے ٹکٹ وصول نہ ہوئے
مینجر نگار

غزل:

فراق گورکھپوری

جولا نگہ حیات کہیں ختم ہی نہیں
 مانا کہ تیرے لطف و کرم میں کمی نہیں
 کل تجھے چھوٹنے کی خبر ہو رہی راز
 تکلیف ہجر کو نہ بنا خواب جاوداں
 ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حسنِ یار کو
 غفلت حیاتِ عشق کی چونکی ہوئی سی ہے
 ہنگامہ زارِ حشر نظر کا فریب تھا
 تیرے کرم سے بھی نہ ہوئی کم فسادگی
 نیند آپلی ہے انجمِ شام ابد کو بھی
 بیخود سے تھے تو وقت کا یہ بھی فریب تھا
 ہم غمزدوں کی گفتگو، تلخ پر نہ جا
 یہ کیفیت سکونِ سحر میں کہاں کی ہے
 منزل نہ کر، حدود سے دنیا بٹی نہیں
 آسان اس قدر تو تری دوستی نہیں
 لیکن یہ بات آج کسی سے چھپی نہیں
 غم کی شبِ دراز بھی اتنی بڑی نہیں
 اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں
 اب پاسبانِ عمر رواں موت بھی نہیں
 تیرے سوا وہاں بھی جو دیکھا کوئی نہیں
 شاید تری خوشی بھی ہماری خوشی نہیں
 آنکھ اہل انتظار کی اب تک لگی نہیں
 ہم اور تجھ کو دل سے بھلا دیں کبھی نہیں
 ”قسمت بری ہی طبیعت بری نہیں“
 وہ شام ہو جو صبح بھی ہو کر کٹی نہیں

زہرا بہ قنارے نشو و نما نہ دے
 وہ زندگی فراق کوئی زندگی نہیں

غزل:

نظر حیدر آبادی

درد مقام عشق ہے درد ہی جان عشق ہے
میں تو وفا شعار ہوں، میری طلب، ترا کرم
اسے غم دل ترا مقام، عرش سے بلند تر
بارِ الم اٹھائے جا درد میں مسکرائے جا
درد کی منزلوں کو دیکھ درد کی گمراہی نہ دیکھ
اپنے پہ اعتماد رکھ میری طرف کبھی نہ دیکھ
حسرت آگہی بڑھا منزل آگہی نہ دیکھ
تیری حیات موت ہے موت میں زندگی نہ دیکھ
کچھ نہ دیا تو کیا نظر درد کی لذتیں تو دیں
حسن کی بخششوں کو دیکھ حسن کی پیرخی نہ دیکھ

غزل

سکندر علی وجد

حقیقت ہے جا دو بیانی نہیں ہے
سراسر خطا تھی نگاہِ تمنا،
دل و جاں تری طرز پر شش کے صدق
دُراشک لشد پلوں پہ تھم جا!
تفس ہے یہ اسے زورِ بازو و قفس ہے
مروت گراں ہے محبت گراں ہے
یہ بتا ہے ظالم، کہانی نہیں ہے
گہنہ نگار تیری جوانی نہیں ہے
مجھے تجھ سے کچھ بدگمانی نہیں ہے
مجھے تیری قیمت گراں نہیں ہے
یہاں رخصت پر قستانی نہیں ہے
یہاں دوستوں کی گراں نہیں ہے
تصویر سمجھ وجد طبع رسا کا
بلا کوئی بھی آسمانی نہیں ہے

غزل:

فضل الدین اشراقیم - اے

زندگی ہے مستقل اک دردِ سر
کوئی جلوہ ہے، نہ کوئی جلوہ گر
تھک گیا ہوں، رک نہیں سکتا مگر
پھول کی آغوش، کلیوں کی کشتار
کل مری، ہستی تھی تفسیرِ حیات
کل تھی نبضِ دہر پر میری نگاہ
کل مرے جلوے تھے نہ تابِ چمن
کل مری قسمت میں تھی معراجِ طو
کل بجھاتے تھے یہی پھولوں کی پیاس
کل تک اپنی زندگی تھی زندگی
پھر وہ شاید التفاتِ آمادہ ہوں
دیکھ تو میری نیازِ آگینیاں
زندگی کچلا ہوا اک پھول ہے
خشک کانٹے، دھوپ اور گرد و غبار
تم کو پایا اور پھر کھو بھی دیا
دیکھئے، دنیا بنے یا دل بنے
لے اثر اب جھک نہیں سکتی جبین

اے نیازِ چارہ سازد چارہ گر
پھر بھی اک جانب بہکتی ہے نظر
زندگی اپنی جگہ ہے وہ سفر
منظر رہتی ہے تیری، ہر سحر
آج کہلاتا ہوں میں دیوانہ سر
آج خود مجھ کو نہیں اپنی خبر
آج ہوں میں اک چراغِ رہگذر
آج ہوں ذروں سے بھی پامال تر
آج آئسو گر رہے ہیں خاک پر
آج ہے اک داستانِ نشر
دل کی دھڑکن ہو چلی ہے تیز تر
پھول کیا کانٹوں پہ رکھ دیتا ہوں سر
کیا لے گا پتیوں کو جوڑ کر
یہ بھی ہے کیا آپ ہی کی رہگذر؟
یہ کہانی بھی تھی کتنی مختصر
کھینچتا ہوں کچھ لکیریں خاک پر
نقش پا ہو سامنے یا سنگ در

غزل:-

وہم و گمان ہستی فانی مٹا کے دیکھ
ہر موجِ انبساط پر سر دھن رہا ہے تو
تو بہنِ عشق ہے یہ امیدوں کا سلسلہ
وہم ورجا کر شمعِ احساسِ ظفر

یعنی تعینات کے پردے اٹھا کے دیکھ
اے دل سرور کاوشِ نہاں بڑھا کے دیکھ
محرومیوں کو عشق کا حاصل بنا کے دیکھ
نقشِ غم و نشاطِ زمانہ مٹا کے دیکھ

محمد مظفر الدین ظفر (عثمانیہ)

بہارِ پنجاب

نیاز فچپوری کی دیگر تصانیف

غلام ربانی گھوٹ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ تحقیقات تبصرہ کیا گیا ہے جس بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کہاں کس کس طرح رائج ہوئی نیز کہ مذہب عالم نے اسکے علاج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے قیمت تین روپیہ (۳۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔	مجموعہ تنقیدیں و جوابات ان تینوں جلدوں میں سترہ سے لیکر سترہ تک کے استفسار و جواب شائع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار کیا ہو کہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپیہ (۳۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم	جذبات بکھا شا جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔ قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲) خریداران نگار سے تین آنہ (۳) کم	فلاسفہ و تدبیر اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں :- ۱۔ چند گھنٹے فلاسفہ و تدبیر کی روجوں کے ساتھ ۲۔ مادیوں کا مذہب۔ ۳۔ حرکت کے کرشمے۔ نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (۱۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے چار آنہ (۴) کم
شاعر کا انجام جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ قیمت دس آنے (۱۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے دو آنہ (۲) کم	فرست الید مولفہ نیاز فچپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی باتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (۱۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے چار آنہ (۴) کم	مذاکرات نیاز یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالمیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا اخیسہ تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت بارہ آنہ (۱۲) علاوہ محصول خریداران نگار سے تین آنہ (۳) کم	گہوارہ تمدن یہ وہ معرکہ الارا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا بھر میں ذہنیاتی اسکی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ قیمت دو روپیہ (۲۰) علاوہ محصول

جنگ اور ہندوستان

قصد اُنہ سہی مجبوراً اس زمانہ گمرانی میں طب یونانی کی طرف توجہ کیجئے، شاید آپ کی توجہ اس کی ترقی کا باعث ہو، بہترین اور با اصول تیار شدہ مرکبات،

طیبی دواخانہ یونانی

سے حاصل کیجئے جو سو سو سال سے طب یونانی اور پبلک کی خدمت انجام دیکر غیر فانی شہرست حاصل کر چکا ہے فہرست دواخانہ مفت طلب فرمادیں

طیبی دواخانہ یونانی

چوک بازار — اندور — ۶۶ محمد علی روڈ بمبئی — ۳

تارکاپتہ: "شاہی" اندور — ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳